اقبال بحضور حضرتِ امیرِ ملّت

مصنّف
محمد صادق قصوری

بحسنِ اہتمام
جانشین امیرِ ملّت حضرت پیر سیّد منور حسین جماعتی
چیئرمین: انٹرنیشنل انجمن خدّام الصّوفیہ و امیرِ ملّت ٹرسٹ پاکستان و برطانیہ

اقبال اور امیر ملّت

○

☆......محمد صادق قصوری......☆

زیر سرپرستی و زیر نگرانی

جانشین امیر ملت، مہر الملت پیر سیّد منور حسین شاہ صاحب جماعتی

آستانہ عالیہ علی پور سیّداں شریف ضلع نارووال (پاکستان)

نام کتاب ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ "اقبالؒ اور امیر ملتؒ"

مصنف ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ محمد صادق قصوری

صفحات ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

سال اشاعت ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ مئی 2012ء

تعداد ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ گیارہ صد

قیمت ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ 300 روپے

۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ناشر ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

امیر ملت پبلیکیشنز (پاکستان) 0300-4660246

ملنے کا پتہ

آستانہ عالیہ علی پور شریف ضلع نارووال

35۔ جہانزیب بلاک علامہ اقبال ٹاؤن لاہور

21-Shakespeare Street, Sparkhill

Briminghim, B-11 4RU (UK)

آئینہ

انتساب

سیدی و مرشدی سنوسیٔ ہند قبلۂ عالم امیرِ ملت

حضرت پیر سیّد حافظ جماعت علی شاہ صاحب

محدّث اعظم علی پوری رحمۃ اللہ علیہ

کے نام۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔

اگر سیاہ دلم، داغِ لالہ زارِ تو اَم
وگر کشادہ جبینم، گلِ بہارِ تو اَم

محمد صادق قصوری

کچھ بیاں اپنا

''اقبالؒ اور امیر ملتؒ'' پیش خدمت ہے۔ اب یہ فیصلہ کرنا قارئین کرام کا کام ہے کہ میں اپنے مقصد میں کس حد تک کامیاب ہوا ہوں۔ اگر اس کتاب میں کچھ خوبی ہے تو یہ میرے اللہ جلّ شانہٗ کی دین ہے اور اگر اس میں کوئی خامی، کوتاہی اور غلطی ہے تو وہ میری نااہلی پر دلالت کرتی ہے۔ قارئین کرام اس سلسلہ میں رہنمائی فرمائیں تاکہ اگلا ایڈیشن غلطیوں سے پاک وصاف آسکے۔

یہ کتاب نبیرۂ امیر ملت حضرت صاحبزادہ مہر الملت پیر سیّد منور حسین شاہ صاحب جماعتی دامت برکاتہم عالیہ کی سرپرستی اور زیر نگرانی لکھی گئی ہے اور ان کے گرانقدر ''پیغام'' سے بھی مزین ہے۔ جناب محترم جمیل اطہر سرہندی ایڈیٹر روزنامہ ''جرأت'' لاہور، جناب محترم پروفیسر قاری مشتاق احمد نقشبندی لاہور، جناب محترم پروفیسر ڈاکٹر محمد اسحاق قریشی، فیصل آباد اور جناب محترم مولانا محمد ذاکر الحسن حیدری، لاہور کا ممنون و مشکور ہوں کہ انہوں نے وہ سب کچھ لکھ دیا ہے جو میں اس کتاب کے بارے میں چاہتا تھا، لہٰذا اب مجھے اپنی طرف سے مزید کچھ نہیں کہنا ہے۔ اللہ تعالیٰ جلّ شانہٗ میرے ان تمام محسنوں کو جزائے خیر سے نوازے اور شاد باد رکھے۔

بڑی ناشکری ہوگی کہ اگر میں جانشین امیر ملتؒ، وارثِ مسند وفکر امیر ملتؒ اور عالمی مبلغ اسلام مہر الملت حضرت الحاج الحافظ القاری پیر سیّد منور حسین شاہ صاحب نقشبندی مجددی جماعتی دامت برکاتہم عالیہ دربار عالیہ علی پور سیداں کا خصوصی شکریہ ادا نہ کروں کہ جن کی قدم

قدم پر سرپرستی، راہنمائی اور حوصلہ افزائی میرا سرمایۂ حیات بنی رہی ہے۔ خداوند عزوجل ان کا سایہ ہماپایہ تادیر سلامت رکھے۔

آخر میں ان تمام حضرات و احباب کا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری ہے، جن کا کسی بھی لحاظ سے تعاون حاصل رہا ہے۔ اللہ تعالیٰ جلّ جلالہ' سب کو خوش وخرم رکھے۔

خاکِ راہ امیر ملّتؒ

محمد صادق قصوری

بانی و ناظم اعلیٰ مرکزی مجلس امیر ملّتؒ

بُرج کلاں ضلع قصور۔ 55051

۲۹۔ اگست ۲۰۰۹ء بروز ہفتہ

پیغام

(جانشین امیر ملت مہر الملت حضرت پیر سیّد منور حسین شاہ جماعتی صاحب دامت برکاتہم عالیہ آستانہ عالیہ علی پور سیّداں شریف ضلع نارووال، پاکستان)

مجھے یہ جان کر قلبی مسرت اور دلی راحت ہوئی ہے کہ جناب محمد صادق قصوری کی تازہ کتاب ''اقبالؒ اور امیر ملتؒ'' زیور طباعت سے آراستہ و پیراستہ ہو کر جلد ہی منصۂ شہود پر جلوہ گر ہو رہی ہے۔ اس سے قبل انہوں نے ''جہانِ امیر ملت''، ''تاریخِ مشائخ نقشبند''، ''مکاتیبِ امیر ملت''، ''تذکرہ شعرائے جماعتیہ''، ''امیر ملت اور آل انڈیا سنی کانفرنس''، ''خیابانِ امیر ملت'' امیر ملت اور تحریکِ پاکستان و دیگر بہت سی کتابیں لکھ کر فکرِ امیر ملتؒ کو عام کرنے کی مساعیٔ جمیلہ کی ہیں۔ اور ''سیرتِ امیر ملت'' کو بھی از سر نو ترتیب دے کر، اہم اضافوں سے مزیّن کر کے نہایت ہی اہم خدمت انجام دی ہے، جس کیلئے وہ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

قصوری صاحب نے حضرت قبلۂ عالم امیر ملت قدس سرہ العزیز کے افکار و نظریات اور حیات و خدمات کی تبلیغ و ترویج کے لئے اپنی زندگی وقف کر رکھی ہے جس کے لئے ہم انہیں مبارکباد دیتے ہیں اور ان کے کام کو بنظرِ تحسین دیکھتے ہیں۔

تازہ کتاب ''اقبالؒ اور امیر ملتؒ'' میں انہوں نے ان تمام غلط، خود ساختہ اور بے بنیاد روایات و واقعات کا تحقیقی انداز میں رد کر کے دودھ کا دودھ اور پانی کا پانی کر دیا ہے جو اقبالؒ کے بعض مفاد پرست، ابن الوقت اور نادان دوستوں نے فکرِ اقبالؒ کو نقصان پہنچانے کے

لئے پھیلائے تھے اور یکطرفہ تحریریں پھیلا کر مہاراجہ کشن پرشاد شاؔد کو تحفظ دے رکھا تھا۔ قصوری صاحب نے ان روایات و واقعات کو حقائق کی کسوٹی پر پرکھ کر ان کو بے نقاب کر کے جرأت مندانہ قدم اٹھایا ہے۔ جس کیلئے حلقہ بگوشان امیر ملت ان کے لئے دعا گو ہیں۔

مہر الملت پیر سیّد منور حسین شاہ جماعتی
دربار عالیہ علی پور سیّداں شریف
ضلع نارووال، پاکستان۔

ابتدائیہ

(جناب جمیل اطہر سرہندی ایڈیٹر روزنامہ ''جرأت'' لاہور)

مکرم و محترم جناب محمد صادق قصوری نے مجھ سے ''اقبالؒ اور امیر ملت'' کے موضوع پر اپنی کتاب کا ''ابتدائیہ'' لکھنے کی فرمائش کی تو سچ یہ ہے کہ مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ انہوں نے کس عرق ریزی سے امیر ملت حضرت پیر سیّد جماعت علی شاہ محدث علی پوریؒ اور شاعر مشرق، حکیم الامت حضرت علامہ اقبالؒ کے روحانی تعلق پر یہ جامع کتاب مرتب کی ہے اور جب اس کتاب کا مسودہ میری نظر سے گزرا تو مجھے اس کی حقیقی قدر و قیمت کا صحیح معنوں میں اندازہ ہوا۔ سچ یہ ہے کہ جناب محمد صادق قصوری نے برصغیر میں مسلمانوں کی تاریخ کے ان دو عظیم کرداروں پر نہایت ہی مبسوط مجموعہ سپردِ قلم کیا ہے جو ہماری موجودہ اور آنے والی نسلوں پر دو برگزیدہ عاشقانِ رسول ﷺ کے باہمی تعلق کی کئی گم شدہ کڑیوں کو واضح اور روشن کرتا چلا جائے گا۔ یہ فی الحقیقت ایک تاریخی دستاویز ہے جو برصغیر ہندو پاک کے اہلِ ایمان کے قلوب کو ہمیشہ ضوفشاں کرتی رہے گی۔

جناب محمد صادق قصوری ہدیہ تبریک کے مستحق ہیں کہ انہوں نے شاعر مشرقؒ اور حضرت امیر ملتؒ کے باہمی روحانی رشتوں کو نہایت سلیقہ اور قرینہ سے صفحہ قرطاس پر منتقل کر دیا ہے۔ علامہ اقبالؒ اور سیّد جماعت علی شاہؒ کا دور برصغیر میں مسلمانوں کے زوال کا زمانہ تصور کیا جاتا ہے۔ اس دور میں حضرتِ علامہؒ نے مسلمانوں کے تنِ مردہ میں نئی روح پھونکنے کے لئے شاعری کو ذریعہ اظہار بنایا۔ اسی طرح حضرت امیر ملت نے اپنی خانقاہ میں

تصوف کی حقیقی روح کو تازہ کیا اور مسلمانوں کو اقبال کی طرف رجوع کرنے کی نہ صرف ترغیب دی بلکہ مسلمانوں کے ملی شاعر کی بے حد حوصلہ افزائی کی، نہ صرف ان کے کام اور پیغام کو سراہا بلکہ روحانیت اور تصوّف میں ان کے بلند مقام و مرتبہ کا بھی اعتراف و اقبال کیا۔

مجھے امید ہے کہ ''اقبالؒ اور امیر ملّتؒ'' کے موضوع پر لکھی گئی اس کتاب کا مطالعہ اپنے زمانے سے جداگانہ اندازِ نظر رکھنے والی دو قومی ملی شخصیتوں کے پیغام کی روشنی میں پاکستان کو ایک جدید اسلامی فلاحی مملکت بنانے کے لئے مصروفِ عمل اہل فکر و نظر کے لئے مینارۂ نور کا کام دے گا۔

جمیل اطہر سرہندی

۱۳۔ نومبر ۲۰۰۸ء

سخنے چند

(جناب پروفیسر قاری مشتاق احمد سابق صدر شعبۂ اسلامیات گورنمنٹ کالج آف سائنس وحدت روڈ، لاہور)

زیرِ نظر کتاب بعنوان اقبالؒ اور امیر ملّت'' جناب محمد صادق قصوری کی تالیف ہے۔ قصوری صاحب کی شخصیت کسی تعارف کی محتاج نہیں، وہ ایک پختہ کار ادیب، گہرے علمی وادبی مذاق کے حامل، سلجھے ہوئے نقاد اور فاضل محقق ہیں۔ کثیر تصانیف کے مصنف اور پچھلی صدی کے علمی و ادبی حلقوں اور شخصیات کا بھرپور مطالعہ ہی نہیں بلکہ ان سے مربوط روابط رکھنے والوں میں ایک فرد ہیں۔ اعلیٰ حضرت امیر ملّت پیر سیّد حافظ جماعت علی شاہ محدث علی پوری رحمۃ اللہ علیہ کے مرید باصفا اور فنا فی الشیخ کے مرتبہ پر فائز ہیں۔ ان کا انداز سادہ مگر اسلوبِ نگارش ان کی ژرف نگاہی کا بین ثبوت ہے۔ معلومات کا دائرہ ٹھوس اور وسیع ہے اور ان کی تصانیف کے حوالے سے مجھے یہ کہنے میں باک نہیں کہ جس عنوان پر قلم اٹھایا ہے اس کی خوب ترجمانی کی ہے اور ادائے حق میں کامل سعی کی ہے اور اس میں نہ صرف کامرانی نے ان کے قدم چومے ہیں بلکہ انہیں قبولیتِ دوام بخشی ہے۔ مرشد کامل کے حوالے سے ان کی تحریروں میں ایک عاشق صادق کی جھلک نمایاں ہے۔ بقول اقبالؒ ؎

صحبت از علم کتابی خوش تراست
صحبتِ مردانِ حُر آدم گراست

☆

اس تازہ تصنیف میں انہوں نے اپنے شیخ کامل کی پاکیزہ زندگی اور حسنِ کردار و

معاملات کے حوالے سے شاعرِ مشرق علامہ محمد اقبال مرحوم کی ان کے ساتھ قلبی وابستگی ، نیاز مندی، ارادت اور باہمی روابط کا تذکرہ ایک جدید انداز سے پیش کیا ہے جو ایک طرف ''اقبالیات'' کے حوالے سے ایک گراں قدر علمی و ادبی اور تحقیقی اضافہ اور بیش قیمت سرمایہ ہے جبکہ دوسری جانب حضرت امیر ملت رحمۃ اللہ علیہ کی حیاتِ مقدسہ کے ایک اچھوتے گوشے کی نقاب کشائی اور ان کی جامع کمالات شخصیت کے اعجاز کا بھرپور اظہار ہے۔

اعلیٰ حضرت پیر سیّد حافظ جماعت علی شاہ صاحب عالی نسب سادات سے تعلق رکھتے ہیں، ان کا خاندان جملہ علمی و روحانی برکتوں کا نقیب تھا، آپ بہترین حافظ اور قاری تھے۔ جامع معقول و منقول عالم باعمل تھے، ایک عظیم مفسر اور یگانۂ روزگار محدث العصر تھے۔ میں نے اپنے استاد زادہ حضرت علامہ سیّد محمود احمد رضوی ''شارح بخاری'' سے سنا کہ حضرت امیر ملت رحمۃ اللہ علیہ نے جامع مسجد وزیر خان لاہور میں منعقدہ جلسہ میں تحدیث نعمت کے طور پر فرمایا کہ فقیر کو دس ہزار احادیثِ نبویہ مع اسناد و روایات حفظ ہیں۔ (سبحان اللہ کیا شان ہے) حافظ الحدیث ہونا اس خانوادہ کا طرّہ امتیاز ہے۔ آپ کے پوتے مخدوم پیر سیّد اختر حسین شاہ صاحب ''بیہقیٔ وقت تھے اور جنہوں نے انہیں دیکھا ہے وہ انہیں ''سرمایہ امیر ملت'' کہتے تھے۔ حضرت امیر ملت رحمۃ اللہ علیہ ایک بے باک خطیب تھے، طریقت میں بڑے پاکباز، زاہدِ مرتاض اور مردِ کامل تھے۔ سلسلہ عالیہ نقشبندیہ مجددیہ کے علاوہ ہر چہار سلاسل میں مجاز تھے لیکن ظاہراً باطناً نقشبندی مجددی تھے۔ سلسلہ عالیہ کے حوالے سے آپ کی شہرت عرب و عجم میں پھیلی اور لاکھوں کی تعداد میں لوگ آپ کے حلقۂ بیعت و ارادت میں داخل ہوئے، برصغیر پاک و ہند میں شاید ہی کوئی علاقہ ہو جہاں آپ کے فیوض و برکات اور انوار نے نوازش نہ فرمائی ہو۔ آپ کی شخصیت ہمہ گیر، جامع کمالات اور عالی صفات تھی۔ آپ ہادی و مہدی، رحیم و کریم، غریب پرور، مربی و محسن، انتہائی شفیق و مہربان تھے۔ لیکن دین کے معاملے میں عقائد حقہ اہل سنت و جماعت کے حوالے سے کسی نرمی یا صلح کلی کے قائل نہ تھے۔ غیر شرعی اور خلافِ سنت امور پر فی الفور ٹوک دیتے اور رہنمائی بھی فرماتے خواہ صاحب

اقتدار ہو یا کوئی اور، خاص ہو یا عام، آپ شریعت کی تیغ براں تھے۔ آپ کی انہی خوبیوں پر اسلامیانِ برصغیر نے آپ کو ''امیر ملت'' کے لقب سے یاد کیا اور اہلِ عرب پر جو خصوصی شفقت رکھتے تھے تو وہ آپ کو ''ابو العرب'' اور ''شیخِ عرب وعجم'' کہہ کر پکارتے۔ اور یہ کوئی مبالغہ نہیں حقیقت نفس الامری ہے۔

☆

حضرت امیر ملت رحمۃ اللہ علیہ کی ذات ایک دبستان علم وعمل ہے۔ آپ کی ہمہ جہت شخصیت پر کتب کثیرہ موجود ہیں لیکن خلاصۂ آپ کی مساعیٔ جمیلہ کا خاکہ کچھ اس طرح ہے:

- اقامتِ دین اور تبلیغ کتاب وسنت کے پیش نظر ہزارہا مساجد اور مدارس کا قیام، مالی امداد اور کامل سرپرستی۔
- دینی کتب کی اشاعت، مسلکِ حقہ اہل سنت و جماعت کے عقائد کی علمی وعملی اور کتابی صورت میں ٹھوس ترجمانی۔
- بدعقیدہ اور بدمذہبوں کی علمی وعملی اصلاح، بدعات وخرافات کا قلع قمع۔
- فتنہ قادیانیت کا پرجوش مقابلہ، اس کی بیخ کنی اور احقاقِ حق کے لئے بھرپور کردار۔
- خدمتِ خلق، خدمتِ فقرا وعلماء، خدمتِ حجاج کے لئے قیام وطعام کا معقول انتظام اور جماعت منزل کی تعمیر۔
- آپ مردِ حرُ تھے اور حریت کی شان خدمتِ فقراء وخلق ہے۔ یحیٰی بن معاذ رحمۃ اللہ علیہ کا قول ہے:

> ''ابناء الدنیا کی خدمت ''لونڈی'' اور ''غلام'' کرتے ہیں مگر ابناء الآخر کی خدمت ''احرار'' اور ''ابرار'' کرتے ہیں۔''

آپ کے زمانے میں اور بعد میں ایسا کوئی نظر نہیں آیا۔ ''رسالہ قشیریہ'' میں منصور الفقیہ کا شعر کچھ یوں ہے:

مَـابَقِیَ فِیْ الْاِنْسِ حُرۃٌ لَا وَلَا فِیْ الْجِنِّ حُرٌّ
قَـدْمَـضٰـی حُـرُّ الفَرِیْقَیْن، فَحلُو العَیْش مُرٌّ

''انسانوں اور جنوں میں کوئی مردِ حر باقی نہ رہا، دونوں گروہوں کے مردانِ احرار رخصت ہوگئے تو زندگی تلخ ہوگئی۔''

- محبت الٰہی کے پیکر، عشقِ نبویؐ سے سرشار، تقویٰ کی تصویر، راہِ شوق اور لقائے محبوب کے لئے ہمہ وقت پا بہ رکاب۔ محبتِ الٰہیہ کے حوالے سے یہ رباعی ترجمان ہے۔

خواہم کہ ہمیشہ در ہوائے تو زیم — خاکے شوم و بزیرِ پائے تو زیم
مقصودِ من بندہ زکونین توئی — از بہرِ تو میرم و برائے تو زیم

- اسلامی تصوف کے داعی، سلسلہ عالیہ نقشبندیہ مجددیہ کے عظیم قائد و نقیب اور برصغیر میں سلسلہ عالیہ کی ترویج کے حوالے سے ٹھوس حکمت عملی۔
- فاضل خلفاء کی تربیتِ روحانی اور ان کے ذریعے اقامتِ دین کا کام۔
- مریدوں کی تربیت، اصلاح اور ان کی زندگیوں میں روحانی انقلاب۔
- تحریکِ پاکستان اور قیامِ پاکستان کے لئے مرکزی کردار۔

☆

حضرت امیر ملتؒ مجاہدات میں محکم اور مشاہدات میں کامل صاحبِ حال تھے، صاحبِ تصرف تھے، مقبولیت میں نہ صرف مرجع خلائق تھے بلکہ مسندِ محبوبیت پر جلوہ افروز تھے، جس کو بھی صحبتِ مقدسہ کی چند ساعات میسر آئیں وہ در والا کا ہی ہو کر رہ گیا۔ یہی حال علامہ اقبالؒ مرحوم کا تھا۔

علامہ اقبالؒ صرف شاعر، فلسفی اور مفکر ہی نہ تھے بلکہ ایک نکھرے ہوئے ''صوفی'' بھی تھے۔ وہ تصوف کا عمیق مطالعہ رکھتے تھے اور انہیں صوفیاء کی دینی خدمات اور تصرفات کا کامل شعور حاصل تھا۔ طریقت انہیں ورثے میں ملی تھی اور اس کی چھاپ ان کی شخصیت و شاعری پر بہت گہری تھی۔ مجھے ایم اے (اردو) کی طالب علمی کے زمانے میں ان کا تفصیلی مطالعہ کرنے

کا موقعہ میسر آیا۔ میں صرف ایک پہلو تک محدود رہوں گا کہ ان کی شاعری میں مشاہیر اسلام اور روحانی بزرگوں کا ذکر ایک اہم ترین خصوصیت ہے اور یہ خوبی کسی اور شاعر میں نہیں پائی جاتی، گو اردو ادب میں ان کا کتنا بڑا مقام کیوں نہ ہو۔ تاہم جزوی طور پر اکبر الہ آبادیؒ اور حالیؔ کی شاعری میں یہ تذکار برائے نام موجود ہیں۔ پروفیسر سیّد عابد علی عابدؔ نے ''شعرِ اقبال'' میں اس کا تفصیلی ذکر کیا ہے۔

حضرت امیر ملّت رحمۃ اللہ علیہ اور علامہ اقبالؒ کا زمانہ فرنگی کی غلامی کا زمانہ تھا اور اس دور میں اقبال کی شاعری انقلابی ہے۔ درسِ بیداری ہے اور مسلم امہ کے لئے فکری اور تحریکی ہے۔ ان کی شاعری کے ادوار کے حوالے سے یہ آخری دور اسلامی شاعری کا زمانہ ہے۔ حضرت امیر ملّت رحمۃ اللہ علیہ سے ان کی وابستگی ارادت تین وجہ سے پختہ ہوئی:

(i) حضرت امیر ملّت رحمۃ اللہ علیہ، ''اقبال کے مردِ مومن'' اور ''روشن ضمیر صوفی'' کی ہو بہو تصویر و تعبیر تھے۔

(ii) نظریۂ پاکستان اور قیام پاکستان کے حوالے سے فکری و نظری ہم آہنگی۔

(iii) عظمتِ اسلام کا کامل احیاء، قوتِ عشق اور محبت رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے اجالا۔

☆

اقبال مردانِ باخدا کی عظمت کے قائل اور ان کی صحبت کے اثرات اور تصرفات کو بخوبی جانتے تھے۔ وہ فرماتے ہیں ؎

کیمیا پیدا کن از مُشتِ گلے
بوسہ زن بر آستانِ کاملے

مزید کہتے ہیں ؎

می نروید تخمِ دل از آب و گل
بے نگاہے از خداوندانِ دل

اقبال بخوبی جانتے تھے کہ دین اور اس کی روح جو تصوف ہے، دل و نگاہ کو مسلمان بنا دیتا ہے۔ اگر دل مسلمان نہ ہوا تو گویا کچھ حاصل نہ ہوا۔

خرد نے کہہ بھی دیا لا الٰہ تو کیا حاصل
دل و نگاہ مسلمان نہیں تو کچھ بھی نہیں

اور دین اور روحانی انقلاب خداوندان دل کی نظر سے ہی پیدا ہوتا ہے۔ جیسا کہ اقبال فرماتے ہیں ۔

دیں مجو اندر کتب اے بے خبر
علم و حکمت از کتب، دیں از نظر

حضرت امیر ملّت رحمۃ اللہ علیہ سے ارادت و صحبت اقبال کی اسی طلب کا مظہر تھی اور انہوں نے اس کا برملا اعتراف کیا ہے۔

جلا سکتی ہے شمع کشتہ کو موجِ نفس ان کی
الٰہی! کیا چھپا ہوتا ہے اہلِ دل کے سینوں میں

☆

دوسرا پہلو پاکستان کے حوالے سے ہے اور اس میں دونوں شخصیات کا بھرپور کردار ہے۔ اقبال نے پاکستان کا تصور پیش کیا تو حضرت امیر ملتؒ نے اس میں روح پھونکی اگر ''حکیم ملّت'' تھے تو حافظ جی سرکار ''امیر ملّت'' تھے۔ پھر سارے عالم نے دیکھا کہ منزل مل کے رہی اور کامیابی نے قدم چومے۔

تیسرا پہلو دین کا احیاء اور عشق مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کا فروغ ہے تو حضرت امیر ملّت رحمۃ اللہ علیہ کی زندگی کا ہر لحہ ہر ساعت اس پر شاہد، عادل ہے اور اقبالؒ اس کے داعی تھے۔ فرماتے ہیں ۔

بمصطفیٰؐ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر باو نرسیدی تمام بولہبی است

مزید کہتے ہیں ۔

قوتِ عشق سے ہر پست کو بالا کر دے

دہر میں اسمِ محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) سے اجالا کر دے

یہ دعوت تھی اور امیر ملت رحمۃ اللہ علیہ اس دعوت پر پہلے ہی سے عامل تھے۔

☆

صاحب تصنیف نے اقبال اور مہاراجہ کشن پرشاد شاؔد اور اقبال کی باہمی مراسلت کے حوالے سے کچھ رائے مانگی ہے تو مختصر سا تبصرہ یہ ہے:

''شاد کی ہرزہ سرائی حسد و بغض کے سوا کچھ اور نہیں اور حضرت امیر ملتؒ کی ذات مثل آفتاب روشن ہے۔ رہا اقبال کا معاملہ تو ہمیں حسن ظن سے کام لینا چاہئے اور مجھے یہ بات محسوس ہوتی ہے کہ ''مکاتیبِ اقبال بنام شاد'' میں ضرور خارجی آمیزش ہے جس کا مقصد شخصیات میں تصادم ہے اور ایک منافق ہندو مہاراجے سے کیا کیا کچھ ممکن نہیں۔''

فاضل مصنف نے اس پہلو پر بھی تفصیلی و تحقیقی روشنی ڈالی ہے اور حق کو واشگاف کرنے میں احقاق حق اور ابطال باطل کا مظاہرہ کیا ہے۔ اور ایک عبقری، دینی و روحانی شخصیت کا ٹھوس دفاع ہی نہیں کیا بلکہ علامہ اقبال کی شخصیت کے تضاد کو دور کرنے میں صاف گوئی سے کام لیا ہے۔ اللہ کریم جلّ شانہ' ان کی اس سعی کو قبول فرمائے اور قبولیتِ عامہ کے شرف سے مشرف کرے اور مرشد کریم کے فیضان کرم سے مزید نوازش فرمائے

(ریٹائرڈ) پروفیسر قاری مشتاق احمد

سابق صدر شعبہ اسلامیات

گورنمنٹ کالج آف سائنس وحدت روڈ، لاہور

۵۔ نومبر ۲۰۰۸ء

مقدمہ

(پروفیسر ڈاکٹر محمد اسحاق قریشی سابق پرنسپل گورنمنٹ کالج فیصل آباد و سابق وائس چانسلر محی الدین یونیورسٹی نیریاں شریف، (آزاد کشمیر) حال صدر مرکزِ تحقیق فیصل آباد)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ہ

تاریخ نگاری کی اہمیت ہر دور میں مسلّم رہی ہے کہ یہ صرف واقعات و حادثات کی تجمیع ہی نہیں، انسانی معاشرت کی پیش رفت کی حکایت بھی ہے۔ انسان فطرتاً معاشرتی حس رکھتا ہے۔ اس حس کا تقاضا ہے کہ باہمی تعلقات و روابط کو محفوظ رکھا جائے تاکہ یہ تمدن کی افزائش کا ذریعہ بن سکے۔ انسانی حافظہ کا قدیم ترین مظہر یہی حوالہ رکھتا ہے، انسان کے کردار و سیرت، میلانات و رجحانات، تصورات و تخیلات حتیٰ کہ اعمال و افعال کو تہذیبی و تمدنی ارتقاء کا حصہ بنتا ہے۔ اس لئے ان کا کوئی گوشہ بھی نظر انداز نہیں کیا جاتا، اس حوالے سے فرد و اجتماع یکساں اہمیت رکھتے ہیں، یہی وہ احتیاج ہے جس نے انفرادی رویوں کو بھی محصور کیا اور اجتماع رویوں کو بھی محفوظ رکھا۔

☆

سوانح حیات لکھنے کا رواج بڑا پرانا ہے کہ یہ بھی تاریخ نویسی کا ایک گوشہ ہے، ہر قوم و نسل نے اس کی اہمیت کو سمجھا ہے اور اس پر توجہ دی ہے مگر اس کو ایک طاقت ور تحریک، اسلامی تعلیمات نے بنایا ہے، یہ اس لئے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم، اسوۂ حسنہ بھی تھے اور معیار نجات بھی، ضرورت تھی کہ اس حیات مبارکہ کے ایک ایک لمحہ کو شمار کر لیا جائے تاکہ انسان کسی

دور اور کسی مرحلے پر بھی بے توفیق نہ رہے۔ سیرت مبارکہ کا ہر رخ ایک لاکھ چوبیس ہزار یا کم و بیش، عقیدت مندوں کی نظروں میں تھا۔ یہ ہر انسان کی اپنی ضرورت کا معاملہ تھا۔ اس لئے آفتابِ صداقت کی ہر کرن کو صداقت شعاری کا اعتماد حاصل تھا۔ پھر یہ خیال کہ صداقتوں کو محفوظ رکھنے والے کون تھے، اور وہ کس طرح اس مشن میں کامیاب ہوئے، مزید تحریک دے رہا تھا کہ ان سعادت مندوں کے لمحاتِ حیات بھی ضائع نہ ہو جائیں کہ اس سے انسانی شرف کے اساسی حوالوں کا ضیاع ہو جاتا۔ تاریخ کو مسلمان ملت نے داستان سرائی سے صداقت آشنائی کی رفعتوں سے ہم کنار کیا۔ یوں فن تاریخ کو معتبر اور باوقار مقام حاصل ہوا۔ معاندین نے بہت مغالطے پیدا کیے، دشمنوں نے سچائی کو کذب آلود کرنے کے ہزار حیلے کیے، بدفطرتی کے کئی رخ سامنے آئے اور ریشہ دوانی نے کئی روپ بدلے مگر ظلمت پسندوں کی بہر رخ منفی کاوش کے باوجود تاریخ انسانی کا اگر کوئی اجلا، بے غبار اور لائق اعتماد تابندہ چہرہ ہے تو وہ ''تاریخ اسلام'' کا ہی ہے۔ الحمد للہ! مسلمان امت کے ہاں تاریخ، داستان سرائی نہ تھی، حقیقت آشنائی تھی، انتساب کا کذب صرف بدنیتی ہی نہ تھا، بہتان تھا جو لائق مواخذہ تھا۔ یہ بجا کہ مفاد پرست افراد اور مفاد پرست گروہوں نے تاریکیوں کے بہت سے سائے لہرائے تاکہ حقیقت تہہ دام آ جائے مگر بقول اکبر الہ آبادی۔

اگرچہ لفظوں کی بدلیوں میں چھپا ہے معنی کا چاند اکبر
مگر یہ معنی ہیں ایسے روشن کہ چاند کی طرح چھن رہے ہیں

یہ ضرور ہے کہ ان معاندانہ رویوں نے مورخ کو احتیاط کی روش اپنانے کی تحریک دی ہے، اسی احتیاط نے جرح و تعدیل کے فن کی پرورش کی ہے اور ہر دور میں مورخ کا قلم محتاط رہا ہے۔

☆

عصر حاضر میں اسلامی تاریخ کا ہر منظر اس احتیاط کا متقاضی ہے اس لئے کہ معاندت کی فضا گھمبیر ہوگئی ہے، ایسے ایسے فن کار جنم لے چکے ہیں کہ بقول فاضل بریلوی علیہ الرحمۃ

آنکھ سے کاجل بھی چرانے کا غرور رکھتے ہیں، اس لئے ان دنوں ملّت کو اپنے سرمایۂ کرداراور جنس صداقت کو بچانے کے لئے ہمہ وقت بیدار رہنا ہے کہ لمحوں کی غفلت صدیوں کے اضطراب کو جنم دیتی ہے۔ یہ کوئی موہوم خوف کی صورت نہیں، حالات کا برملا اظہار ہے کہ شواہد کی موجودگی اور دلائل کی پختگی کے باوجود حقائق کو سبوتاژ کرنے کی کوشش ہو رہی ہے۔ اس کی ایک عملی مثال دیکھئے۔

برصغیر میں مسلمان عدل و انصاف کی قبا اوڑھے شریفانہ قوت کا نشان بن کر آئے تھے، برصغیر کا ہندو، انسانی معاشرے کو اونچ نیچ کی ایسی تقسیم میں مبتلا کر چکا تھا کہ برہمن خواہ کس قدر بدعمل ہو، برتری کا مظہر تھا اور شودر اخلاق و کردار کا کیسا ہی پیکر ہو، ذلت کا اسیر تھا۔ وہ ہندی ہوتے ہوئے بھی غلام تھا کہ اس پر شرف آدمیت کا ہر دروازہ بند تھا حتیٰ کہ وہ برہمنی کلمات کو سننے کا حق بھی نہ رکھتا تھا۔ ایسے منقسم معاشرے پر اسلام کے داعی حکومت کرنے آئے جو خود غلام تھے، یہ تقدیر کا کس درجہ پر جلال فیصلہ تھا کہ اپنے غلاموں سے نفرت کرنے والوں کو غیروں کے غلاموں کے سامنے پرنام کرنا پڑا۔ اس سے معاشرت کی انتہاؤں کو معقولیت کی راہ تلاش کرنے میں آسانی ہوئی۔ یہ انقلابی اقدام کی ترتیب صوفیاء کے دم قدم سے ہوئی۔ برصغیر کی اسلامی شناخت صوفیاء کرام کے احسان کو کبھی بھی نظر انداز نہیں کر سکتی۔ مگر بدقسمتی دیکھئے کہ فریبِ خیال کی وہ آندھی چلی کہ محسنین معتوب گردانے گئے، شور ہوا، تحریکیں چلیں کہ یہ اکابر صوفیاء جن کے فیضان سے دین کی نعمت ملی تھی، دین کے دشمن قرار دیئے گئے، توحیدِ حق کی ترویج کی خاطر جان دینے والے مشرک ٹھہرے۔ یہ تاریخ انسانی کا وہ المیہ ہے جس نے حقائق کو یوں پامال کیا کہ الحذر، الحفیظ۔ کیا ایک صداقت شعار مورخ کا فرض نہیں کہ وہ اس سیل باطل کے سامنے پوری قوت اور پورے ایقان سے کھڑا ہو جائے؟

☆

تحریک پاکستان ایک بقائے ملّت کی تحریک تھی کہ کفر منہ زور ہو گیا تھا۔ مغربی استعمار نے ملّت کے وجود کو سازشوں سے لرزا دیا تھا، اور تو اور سرمایہ عقیدت اور مرکزِ ایمان ذات

پر حملے ہونے لگے بلکہ مد مقابل تراشے جانے لگے تھے۔ لازم ہو گیا تھا کہ اگر ملتِ اسلامیہ کو برصغیر کی سرزمین پر باقی رہنا ہے تو تحفظِ ذات کی کوششوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا جائے۔ حیرت ہے جب یہ غلامی کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی قوم بیداری کے لئے انگڑائیاں لینے لگی تھی تو دین کے بعض دعوے دار اس قوم کو بے حسی کی افیون دے رہے تھے۔ ایسے میں جن باصلاحیت اور بیدار مغز افراد نے بقائے ذات کا علم اٹھایا اور قوم کو منزل آشنا کیا ان کو یوں گوشۂ خمول میں دھکیلا گیا کہ ان کا ذکر کسی مستند نوشتے میں شامل نہ رہا۔ جو قوم کو ہندو ہمسائیگی کی برکات کا درس دیتے رہے تھے اور فراستِ مومنانہ کی ہر صورت کی ظلمتوں میں دھکیلتے رہے تھے وہ ''میر کارواں'' بھی کہلائے اور ''دیدہ وری'' کی عظمتوں کے حامل بھی قرار پائے۔ یہ انوکھا کھیل تھا جو امت کی تقدیر کے ساتھ کھیلا جا رہا تھا۔ اس بے صری کا ازالہ کیسے ہو؟ یہ خیال دردمند اصحاب کو بے چین کرتا رہا مگر بے حسی کا تو کوئی علاج نہیں ہوتا کہ

☆

منزل انہیں ملی جو شریکِ سفر نہ تھے

کیا صاحبِ نظر اہلِ علم کا فرض نہ تھا کہ وہ قوم کو ان مغالطوں سے نکالتے، کج راستے کبھی منزل آشنا نہیں ہونے دیتے تو کج فہمی کب درست استخراج کا موقعہ دیتی ہے۔ نصاب کی کتب ہوں یا تمام معلوماتی رسائل، ذرائع ابلاغ کی یلغار ہو یا سیاسی برتری کا کوئی منصب، سچ پسپا ہو رہا تھا اور جھوٹ سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ ایسے میں جن اصحابِ دانش نے راستی کے سفر کا اہتمام کیا، مفاداتی حملوں کی زد میں آئی ہوئی ملت کو خلوص کا پیغام پہنچایا، وہ یقیناً محسنینِ ملت ہیں۔ تاریخ کا شعور رکھنے والے متلاشیانِ حقیقت ایسے لوگوں کے احسان مند رہیں گے جنہوں نے ان چوپائی حملوں سے ملت کو نجات دلانے کی سعی کی۔ ضروری تھا کہ حقائق کا ادراک رکھنے والے اصحابِ قلم و قرطاس اپنا فرض ادا کریں تاکہ درست فکر کو جلا ملے اور راستی کا سفر شروع ہو۔ یقیناً جن اصحاب نے اس فریضہ کا بیڑا اٹھایا، ان میں ہمارے دوست، صاحبِ فکرِ مستقیم جناب محمد صادق قصوری بھی ہیں۔ قصوری صاحب نے یہ فرض

کس خوش اسلوبی سے ادا کیا، یہ ان کی تحریروں سے مترشح ہے۔ اس حقیقت سے انکار نہیں کیا جاسکتا کہ یہ فرض جو اگر عین نہ تھا تو کفایہ ضرور تھا، قصوری صاحب نے عمدہ طریق سے نبھایا، تاریخ پاکستان کی حقائق کی روشنی میں، دلائل و براہین کے ساتھ تدوین، راست فکر مورخ کا فرض ہے، یہ عمومی فرض اب بھی کسی مردِ حقیقت شناس کی راہ دیکھ رہا ہے۔ قصوری صاحب نے ایک کام ضرور کردیا ہے کہ محسنین کے گرد لپٹے ہوئے غبار کو دھو ڈالا ہے، جس سے بہت سے مناظر روشن ہوگئے ہیں۔ قصوری صاحب کا اپنا موعودِ ذہنی بھی ان کی تحریروں میں چھلکتا ہے کہ ہر انسان دلچسپی کے موضوعات پر ہی قلم اٹھاتا ہے۔

☆

محترم محمد صادق قصوری صاحب کے لئے ایک سہولت حاصل ہے وہ یہ کہ ان کے ممدوحین، تحریکِ پاکستان اکابر میں سے ہیں، امیر ملت حضرت پیر سیّد جماعت علی شاہ علیہ الرحمۃ سلسلہ عالیہ نقشبندیہ کے نامور شیوخ میں سے ہیں۔ علی پور سیّداں (ضلع نارووال) کے سادات گھرانے سے آپ کا تعلق ہے، چورہ شریف (اٹک) کے نقشبندی سلسلہ سے تعلق ہے۔ ایک صاحبِ نسبت بزرگ ہونے کے ساتھ ایک لائقِ اعتماد عالم دین ہیں۔ آپ ان بزرگوں کی یادگار تھے جو علم و عمل کے حسین امتزاج کے حامل رہے تھے۔ تفقہ اور تصوف جب باہم یکجا ہو جائیں تو بقول امام مالک علیہ الرحمۃ متحقق وجود پیدا ہوتا ہے۔ عالم اور صوفی کا ایک وجود میں مجتمع ہو جانا ایک کرامت ہے اور پھر آپ کے وجود میں خدمتِ خلق کا جذبہ بھی لافانی تھا، سیاسی بصیرت اس پر مستزاد تھی۔ اسی لئے برصغیر ہی میں نہیں دیگر ممالک میں بھی آپ کی منزلت دیدنی تھی۔ عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کے جمال نے شخصیت کو مرکزِ رشد بنادیا تھا۔ جناب قصوری صاحب کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ ان کی نسبتِ ارادت ایک صاحبِ عظمت وجود کے ساتھ ہے، اس لئے تصنیفات و تالیفات کا بہت بڑا ذخیرہ اسی نسبت کا وقار لئے ہوئے ہے، تقریباً سات کتب کا خصوصی موضوع حضرت امیر ملت علیہ الرحمۃ کے حوالے سے ہی ہے۔

☆

جنابِ قصوری صاحب کی عقیدت کا دوسرا مرکز بطلِ حرّیت مجاہد ملّت مولانا محمد عبدالستار خاں نیازی علیہ الرحمۃ کی ذات ہے، جو ایک عالمِ دین، سیاسی راہنما اور تحریک پاکستان کے نامور سپاہی تھے۔ تقریباً دس کتب آپ کی ذات کے حوالے سے لکھی گئی ہیں۔

☆

نسبتِ نقشبندیہ نے قصوری صاحب کو ''اولیاءِ نقشبند'' کو موضوعِ سخن بنانے کی بھی تحریک دی ہے، آٹھ سے زائد نگارشات نقشبندی حوالے سے مزین ہیں، باقی تصنیفات میں بیشتر کا تعلق تحریکِ پاکستان سے ہے، چالیس کے قریب تصنیفات و تالیفات قصوری صاحب کے زورِ قلم کا نتیجہ ہیں۔ ان تالیفات سے مؤلف کی علمی وسعت، تحقیقی گہرائی اور تنقیدی اپج کا اندازہ ہوتا ہے۔ علامہ اقبال علیہ الرحمۃ سے بھی قصوری صاحب کی عقیدت بے پناہ ہے، عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور صوفیائے کرام سے عقیدت وہ مشترک اساس ہے جو علامہ اقبالؒ کو قصوری صاحب کے نزدیک لائق محبت و عقیدت بناتی ہے۔

☆

''اقبالؒ اور امیر ملّتؒ'' محترم محمد صادق قصوری صاحب کی تازہ تر تالیف ہے جس میں علامہ اقبالؒ اور حضرت امیر ملّتؒ کے باہمی تعلق کو موضوع بنایا گیا ہے۔ قربِ ذہنی اور اشتراکِ اہداف کے حوالے سے محققانہ جستجو کی گئی ہے۔ تفصیل کا اجمال یہ ہے کہ دونوں کے دل محبتِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم سے آباد ہیں، دونوں میں ملّت کی درست راہنمائی کا ولولہ ہے، دونوں ملّتِ اسلامیہ کے لئے ایک آزاد وطن کے خواہش مند ہیں۔ دونوں کا شعور دردِ ملّت سے مملو ہے، تصوف اور صوفیاء سے عقیدت دونوں کے موعودِ ذہنی کا حصہ ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ ایک سراپا تقویٰ شعار ہے اور دوسرے میں تقویٰ مرغوب و محبوب ہے، ایک صاحبِ سجادہ ہے تو دوسرا ہمہ جہت عقیدت کا پیکر ہے، ایک ممدوح ہے تو دوسرا مداح، ایک راہبر ہے تو دوسرا راہِ سلوک کا پرخلوص راہی ہے، ایک نقشبندیوں کا ذوقِ دروں رکھتا ہے تو

دوسرا قادریت کی باطنی تپش سے پرسوز ہے، منزل دونوں کی ایک ہے، ایک مجددی نسبتوں سے فیض یاب ہے تو دوسرا مجددی مرکز پر حاضرِ دربار ہے، ایک دربارِ مجدد علیہ الرحمۃ سے فیضان کا طلب گار ہے تو دوسرا بیدار نظری کا خواستگار ہے۔ غرضیکہ ذوق میں اشتراک ہے تو وجدان میں یکسانی ہے۔ فرق یہی ہے کہ ایک راہنما ہے تو دوسرا مسافر۔

☆

جناب محمد صادق قصوری نے مرکز کے اشتراک کی نشان دہی کرنے کے ساتھ عقیدتوں میں بھی یکسوئی کی تلاش کی ہے۔ حضرت امیر ملّت علیہ الرحمۃ کے حلقہ بگوشان میں بھی اسی اشتراکِ ہدف کی نشاندہی ہوتی ہے، یہ ذہنی قرب کا سبب ہوتا ہے کہ ایک کا مطلوب دوسرے کیلئے ممدوح قرار پائے۔ اس طرح قصوری صاحب کئی نامور متوسلین کا ذکر کیا ہے۔ اس ذکر سے مقصود تو عقیدتوں کے اشتراک کو واضح کرنا تھا مگر ان تذکروں سے قاری کو بہت سے اکابر سے آشنائی ہوگئی ہے۔ میں ذاتی طور پر بعض اصحاب کو جانتا تھا مگر جس اجمال سے واضح تعارف دیا گیا ہے، اس سے کئی گوشے بے نقاب ہوئے ہیں۔ راقب قصوری کی بعض نعتیں میرے حافظے میں محفوظ تھیں مگر راقب قصوری کا تعارف بااعتماد نہ تھا، پڑھا تو خوشی ہوئی۔ ڈاکٹر سیّد ظفر الحسن کا ذکر بھی باعثِ انبساط رہا، نظام حیدرآباد کا حضرت امیر ملّت علیہ الرحمۃ سے شرفِ بیعت پانا بھی خوشگوار حیرت کا باعث بنا، غرضیکہ مختلف شخصیات کا مختصر حوالہ قاری کے لئے بہت غنیمت ہے، اس سے کئی مفید معلومات کا در کھلا ہے۔

☆

کتاب کے آخر میں مہاراجہ ''کرشن پرشاد'' کے حوالے سے ایک قدرے طویل مبحث درج کیا گیا ہے جس سے کئی الجھنوں نے جنم لیا ہے۔ اس پر ذرا تفصیل سے گفتگو کرتے ہیں۔

مہاراجہ کشن پرشاد، حیدرآباد دکن کی عثمانی حکومت میں بلند عہدوں پر رہے، پڑھے لکھے آدمی تھے، شاعر بھی تھے، شاد تخلص تھا، نعت و منقبت بھی لکھتے رہے، اپنے آپ کو موحد کہتے

تھے اور ہندو آبادی اور مسلم حکومت کے درمیان ہر دو جانب مضبوط ربط رکھتے تھے۔ ایسے لوگ مفادات کے گرداب میں لڑکھڑاتے رہتے ہیں، مسجد میں آئیں تو نماز میں شریک ہوجاتے ہیں، مندر میں ہوں تو خالص ہندوانہ رسوم ادا کرتے ہیں، ایسے لوگ علمی مرتبت کو عہدوں کیلئے زینہ بناتے ہیں۔ حضرت امیر ملّت علیہ الرحمۃ صرف صوفیٔ باصفاہی نہ تھے، ایک عالم دین متبع شریعت بھی تھے۔ اس لئے خدمتِ خلق کے زعم اور فریب میں نہیں آتے تھے کہ اس طرح امتیازاتِ دین ختم ہوجاتے ہیں۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تو حاتم طائی جیسے سخی کے اخلاق پر پسندیدگی کے اظہار کے باوجود دعائے رحمت نہیں فرمائی تھی۔ یہی رویہ حضرت امیر ملّت علیہ الرحمۃ کا تھا۔ اس پر مفاد پرست راجہ کا برافروختہ ہوجانا عین قرین قیاس ہے مگر اس سلسلے میں چند بنیادی حقائق سامنے رہنے چاہئیں:

- مہاراجہ کو مومن تسلیم نہ کرنا کہ موحد ہونا کافی نہیں، یہ حضرت امیر ملّت علیہ الرحمۃ کا واضح بیان اس بات کی تصدیق کررہا ہے کہ مہاراجہ اس پر ناراض تو ہوا مگر مومن ہونے کا اعلان نہ کرسکا۔ یہ تو وہ معیار تھا جس پر پورا نہ اترنے پر اس کا مکر آشکارا ہوا تھا۔
- میر عثمان علی خان نظام دکن کے مرشد گرامی کی تدفین کے موقعہ پر مہاراجہ اپنے مخصوص رویے کے باعث قبر پر مٹی ڈالنے لگا تو امیر ملّت علیہ الرحمۃ کی غیرتِ ایمانی جوش میں آئی اور آپ نے برمحل ارشاد فرمایا:

> ''کیا مسلمان مرگئے، مٹی کیوں نہیں دیتے، کافر دیتے ہیں اور مسلمان تماشا دیکھتے ہیں۔''

یہ اظہارِ نفرت نہ تھا، صداقتوں کو بے نقاب کرنا تھا تاکہ ملّت کا تشخص مجروح نہ ہوجائے۔

- نظام میر عثمان علی خاں کی صاحبزادی کے انتقال پر مکہ مسجد میں نماز جنازہ ہونے لگی تو مہاراجہ پہلی صف میں آکھڑا ہوا، اس پر بھی حقیقت آشکار کرتے ہوئے امیر ملّت علیہ الرحمۃ نے فرمایا:

''اس کو مسجد سے باہر کرو ورنہ سب کی نماز پلید ہوگی۔''

مہاراجہ نکلا تو سہی مگر نظام کی توجہ کا خواستگار بھی ہوا۔ اس پر نظام کا ردعمل بھی بڑا واضح تھا، ''ہاں، ہاں، شاہ صاحب صحیح فرماتے ہیں۔''

بعد میں جب حرفِ شکایت زبان پر لایا تو بھی نظام کا جواب تھا:

''مہاراج آپ کیوں نماز جنازہ کے واسطے آئے تھے، میں اس امر میں کچھ نہیں کرسکتا ہوں۔''

یہ رویے ثابت کررہے ہیں کہ نظام کو بھی یقین تھا کہ ''مہاراج، اسلام دوستی کا صرف بہروپ کررہے ہیں۔'' مگر حیرت اس پر ہے کہ اسقدر یقین کے باوجود مہاراج سلطنتِ نظام میں کس قدر رسوخ پاچکا تھا بلکہ کس قدر دیدہ دلیر ہوچکا تھا کہ وہ مسلمان خواتین سے شادیاں رچارہا تھا مگر حکومت اس پر خاموش تھی، یہ رویہ چشم کشا ہے کہ اکثریت کس قدر منہ زور ہوجاتی ہے اور حکمران اپنی ذاتی تقویٰ شعاری کے باوجود کس طرح صلح کلی کا لبادہ اوڑھے رہتے ہیں:

☆

''ایک سیّد زادی کو نشانۂ ہوس بنانا اور پھر زبردستی پابندِ زوجیت کرلینا، اس معاشرے میں دینی اقدار و تعلیمات کے انحطاط کی خبر دیتا ہے، یہی فقدانِ غیرت تو تحریک پاکستان کے لئے محرک بنا تھا۔ اس پر انفرادی یا جزوی ردعمل بھی سامنے آیا مگر یہ تو واضح ہے کہ غیروں کے حوصلے کس قدر بلند ہوچکے تھے، اس غیر ایمانی صورتِ حال پر حضرت امیر ملّت علیہ الرحمۃ کا رویہ یقیناً مومنانہ شان کا حامل تھا۔''

☆

مہاراجہ کرشن پرشاد کی نعتیں اس کے حیطہ اسلام میں آنے کی دلیل ہرگز نہیں کہ بہت سے غیر مسلم شعرا اس سے بہت بہتر نعت کہہ رہے تھے، کسی نے بھی نعت کی بنیاد پر اسلام قبول کرنے کا استخراج نہیں کیا۔ یہ تو توفیق تھی جو کسی کو بھی حاصل ہوسکتی تھی۔ مہاراجہ کی نعتیں

اظہارِ عقیدت تو ہیں مگر ان میں ایمانی جذبوں کا ولولہ کہیں نہیں ہے۔ میرے نزدیک ایک مسلمان حکومت کے موقع پرست وزیر کا یہی رویہ ہونا چاہیے تھا کہ تلبیس کے کئی رخ برصغیر کے باسیوں کے ہاں عام رہے ہیں۔

☆

ان تمام واقعات میں اگر کوئی روایت یا رویہ پریشان کن ہے تو وہ علامہ اقبالؒ کے حوالے سے ہے۔ تمام روایات کا ناقدانہ جائزہ میرے نزدیک تو اس استخراج کا متحمل نہیں ہے کہ شاید یہ معاشی جبر کا شاخسانہ تھا۔ علامہ مرحوم کی پوری زندگی اور آپ کا ایقان اسقدر بے حقیقت مفاد کا اسیر ہو جائے ممکن دکھائی نہیں دیتا۔ مولانا گرامی کے نام خط میں تو اس معاشی رجحان کا ذکر نمایاں نہیں، معمول کی بات تھی جو برملا بھی نہ تھی، اس سے کسی جھول کا استنباط مناسب نہ ہوگا۔ پھر یہ تمام روایات محمد عبداللہ قریشی کی جانب سے ہیں۔ روایتِ فرد کسی کردار کے تعین کے لئے کافی یا لائقِ اعتماد دلیل نہیں ہوتی۔

☆

علامہ اقبال کے حوالے سے مہاراجہ کو خراج محبت کے اظہار کے لئے ایک نظم بھی درج کی گئی ہے جو ''اقبال اور حیدر آباد دکن'' کے مصنف ''نظر حیدر آبادی'' کی مطبوعہ روایت ہے، نظم چونکا دینے والی ہے کہ کہاں علامہ اقبال جیسا صاحبِ مرتبت اور کہاں ایک ریاست کا ہندو وزیر، یقیناً ایک ایک مصرعہ مضطرب کرتا ہے۔ اگرچہ آخری شعر اس رویے کی توجیہ کرتا ہے کہ

شکریہ احسان کا اے اقبالؔ لازم تھا مجھے
مدح پیرائی امیروں کی نہیں میرا شعار

مگر جب علامہ مرحوم نے اسے اپنے کسی مجموعہ میں شامل ہی نہ کیا تو معلوم ہوا کہ علامہ اسے اپنے رویوں کا حوالہ نہیں بنانا چاہتے تھے۔ تو جو نتیجہ فکر خود صاحبِ کلام کے نزدیک لائق حفاظت نہ ٹھہرے، اس پر استدلال مناسب نہیں، قلم زد کیا ہوا کلام تاریخ شعر کا

تو شاید حصہ بن سکے، شاعر کے کلام پر نقد کا حصہ نہیں بن سکتا۔ یہ تو رد کئے ہوئے کلام کو گوشۂ خمول سے اٹھا کر ذات سے پیوست کرنا ہے۔ یہ بھی خیال رہنا چاہئے کہ یہ ''مہاراجہ نمبر'' کا حصہ بنا، اس کو شاعر کی پسند کے بغیر یوں شامل اشاعت کرنا شاعر کے ساتھ انصاف نہیں۔

مہاراجہ، حضرت امیر ملت علیہ الرحمۃ کے ایمانی جذبوں سے خفا تھا، اس خفت کو مٹانے کے لئے اس نے ہر حربہ استعمال کیا جو وہ کرسکتا تھا، نظام کو بدظن کرنا چاہا مگر وہاں سے جب یہ جواب ملا کہ:

> ''شاہ صاحب برسوں سے یہاں آتے ہیں، میں ان کو بلاتا ہوں، ان کے لاکھوں مرید ساری دنیا میں ہیں، چند لوگوں کو ان سے حسد ہوگیا ہے، حق بات کو سیاسی مسئلہ بنانا ''فتنہ پروری'' ہے، اب مخالفین نے شکست کھائی ہے۔''

دوسرا حربہ علامہ اقبالؒ سے اپنے حق میں کچھ کہلوا لینا تھا، یوں محسوس ہوتا ہے کہ اس پیوندکاری کے لئے بڑی محنت کی گئی ہے۔ حتیٰ کہ ایک خط بھی تیار کرلیا گیا ہے۔ خط کا حرف حرف اعلان کررہا ہے کہ یہ مفاد پرستی کے جذبوں کے تحت تیار ہوا۔ علامہ اقبالؒ کا مقام ومرتبہ اس قدر پست سطح کے لئے کسی طور موزوں نہ تھا، علامہ تو امیر ملت علیہ الرحمۃ کے نہ صرف یہ کہ مداح تھے بلکہ بے پناہ گرویدگی رکھتے تھے۔ آپ سے ایسا جانبدارانہ تحریر کا صدور ناممکنات میں سے ہے۔ بنگلور کے فساد کے حوالے سے جو خط لکھا، وہ کہاں گیا؟ یہ مطابق واقعہ نہیں ہے بلکہ یہ دعویٰ کی تصدیق کی ناکام کوشش ہے۔ آخر پر ''خادم کہن'' کا مرکب تو ''اقبالیات کے سارے مشن پر ضرب کاری ہے۔ مجھے جناب محمد صادق قصوری صاحب کے اس استخراج سے اتفاق ہے کہ

> ''میرا گمان غالب ہے کہ یہ خطوط مہاراجہ یا اس کے کسی مداح کی ایجاد ہیں ورنہ علامہ اقبالؒ سے ایسی توقع ہرگز ہرگز نہیں ہوسکتی۔''

میں سمجھتا ہوں کہ نامور افراد کے ساتھ مطلب پرست لوگوں کا ایسا رویہ ایک روایت بد

ہے جو کئی مقامات پر نظر آتی ہے۔ ''ملت از وطن است'' کا نعرہ لگانے والوں نے بھی علامہؒ کی گرفت پر تاویلات کا ایک گورکھ دھندا کھڑا کیا تھا اور پھر علامہ کی معذرت کا بھی اعلان کیا تھا، حالانکہ وہ اشعار اب بھی ''ارمغان حجاز'' کا حصہ ہیں۔ خواہشات شدید ہو جائیں تو حافظے بھی ماؤف ہو جاتے ہیں اور نظریں بھی چندھیا جاتی ہیں۔

جناب قصوری صاحب نے امیر ملت علیہ الرحمۃ اور علامہ اقبال علیہ الرحمۃ کے تعلقات پر ایک جامع تبصرہ کیا ہے۔ کتاب قارئین کے لئے دلچسپی کا باعث بنے گی، میں اس کا خیر مقدم کرتا ہوں اور دعا گو ہوں کہ جناب قصوری صاحب کا اشہبِ قلم اسی طرح رواں دواں رہے۔ آمین۔

۲۵۔ مارچ ۲۰۰۹ء

پروفیسر ڈاکٹر محمد اسحاق قریشی
صدر مرکز تحقیق، فیصل آباد

خراجِ تحسین

☆

''ملک کے مشہور طنز نگار ادیب میر محفوظ علی بدایونی (ف ۱۹۴۳ء) نے ایک موقعہ پر ارشاد فرمایا کہ:

''حضرت پیر جماعت علی شاہ صاحب شاید پہلے ''شیخ طریقت'' ہیں کہ جنہوں نے مسلمانوں کے مغربی تعلیم یافتہ طبقے کی اصلاح و تہذیب کا خیال فرمایا اور وہ انگریزی تعلیم یافتہ نوجوانوں سے بھڑکتے اور بدکتے نہیں تھے بلکہ وہ ان کی طرف دستِ خلوص دراز کرتے تھے اور اس کے نتیجہ میں اس جماعت سے حضرت پیر صاحب نے کارآمد نوجوان منتخب کر کے کام میں لگا دیئے۔''

(پروفیسر ڈاکٹر محمد ایوب قادری آف کراچی، ''مقدمہ'' بر ''حضرت امیر ملتؒ اور ان کے خلفاء'' مؤلفہ محمد صادق قصوری مطبوعہ مکتبہ نعمانیہ سیالکوٹ ۱۹۸۳ء صفحہ ۱۷، ۱۸)

☆

(مکتوب گرامی جناب ڈاکٹر محمد طاہر حمید تنولی، معاون ناظم (ادبیات) اقبال اکیڈمی پاکستان، لاہور بنام محمد صادق قصوری محررہ ۱۳ نومبر ۲۰۰۹ء)

''آپ کی یہ علمی کاوش (اقبال اور امیر ملتؒ) قابل صد تحسین ہے۔ ہم دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ آپ کی علمی، ادبی کاوشوں میں ترقی عطا فرمائے۔''

☆

اقبالؒ اور امیرِ ملّتؒ

(حکیم الامّت علامہ محمد اقبالؒ اور امیر ملّت پیر سیّد جماعت علی شاہؒ)

☆

عاشقانِ مصطفےٰ ﷺ اقبالؒ اور سیّد جماعتؒ — خوب سیرت با وفا اقبالؒ اور سیّد جماعتؒ

قوم وملّت کے زعیم اور قوم وملّت کے تھے رہبر — صاحبانِ ذی علیٰ اقبالؒ اور سیّد جماعتؒ

دونوں ہی تھے آسمانِ معرفت کے ماہتاب — سرِ حق سے آشنا اقبالؒ اور سیّد جماعتؒ

اک حکیم الامّت اور اک تھے امیرِ ملّتِ حق — دونوں یکتا رہ نما اقبالؒ اور سیّد جماعتؒ

مست ومخمورِ مئے عشقِ نبی ﷺ اک جہاں کو — ظلِ لطفِ کبریا اقبالؒ اور سیّد جماعتؒ

دونوں تھے تحریکِ آزادی کے باہمّت مجاہد — عزم وجرأت کی صدا اقبالؒ اور سیّد جماعتؒ

ملّتِ اسلامیہ پر دونوں کے بیحد ہیں احساں — افتخار اس قوم کا اقبالؒ اور سیّدِ جماعتؒ

سرگرم ہر دم رہے اسلام کی عظمت کی خاطر — آفریں صد مرحبا اقبالؒ اور سیّدِ جماعتؒ

مخلصانہ ان کا نعرہ اُدۡخُلُوۡا فِی السِّلۡمِ کَافَّه — قائدینِ باصفا اقبالؒ اور سیّدِ جماعتؒ

ایک ہی دی قوم کو میراث بھی فکر وعمل کی — ہم خیال و ہم نوا اقبالؒ اور سیّدِ جماعتؒ

مرقدیں ان کی رہیں فیضؔ الامیں دائم فروزاں
تھے محبانِ خداؒ اقبالؒ اور سیّد جماعتؒ

۲۰۔ اگست ۲۰۰۸ء

☆

(حضرت صاحبزادہ فیض الامین فاروقی ایم اے مدظلہ، مونیاں ٹھیکریاں ضلع گجرات)

☆

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم ؐ

اقبالؒ بحضور امیر ملتؒ

حکیم الامت حضرت علامہ اقبالؒ کو عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی دولت اگرچہ ورثہ میں ملی تھی مگر اس کو جلا قبلۂ عالم امیر ملت حضرت پیر سیّد جماعت علی شاہ محدث علی پوری قدس سرہ العزیز کی صحبت مقدسہ سے حاصل ہوئی تھی۔ چنانچہ حضور سیّد عالم علیہ التحیہ والثناء کا نام نامی اسم گرامی سنتے ہی حضرت علامہ علیہ الرحمہ کی آنکھوں سے آنسوؤں کی جھڑیاں لگ جاتی تھیں۔ حضرت امیر ملت رحمۃ اللہ علیہ کی صحبتِ فیض اثر کی وجہ سے ان کا ایک ایک لمحہ فروغِ عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم اور دہر میں اسم محمد علیہ الصلوٰۃ والسلام سے اجالا کرنے میں گزرا۔ چنانچہ جب لاہور میں ''جشن عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم منانے کے لئے حضرت امیر ملت قدس سرہ العزیز نے اپنی مساعی جمیلہ کا آغاز کیا تو حضرت علامہ رحمۃ اللہ علیہ نے نہ صرف تائید وحمایت کی بلکہ بھرپور ساتھ دیا۔

۱۲۔ ربیع الاول ۱۳۲۹ھ مطابق ۱۴۔ مارچ ۱۹۱۱ء بروز منگل اسلامیہ کالج ریلوے روڈ لاہور میں حضرت امیر ملت قدس سرہ العزیز کی زیر صدارت شاندار طریقے سے ''عید میلاد النبی صلی اللہ علیہ وسلم'' کی تقریب سعید منائی گئی۔ اس سے قبل قبلۂ عالم امیر ملت علیہ الرحمہ کی طرف سے لاہور شہر میں اعلان کیا گیا تھا کہ تمام دکاندار اور اہل حرفہ اپنا کام بند رکھیں اور دن بھر عید میلاد منائیں۔ چنانچہ ایسا ہی ہوا۔

نماز ظہر کے بعد نماز عشاء تک عظیم الشان جلسہ ہوا۔ جس میں نامور علماء دین اور

مشاہیر وطن نے خطاب کیا اور شعرائے شیریں بیان نے نہایت مؤثر نظمیں پڑھیں اور وجد آور نعتوں سے سامعین کے قلب وجگر کو عشقِ رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی دولت سے مالا مال کیا۔ اثر کا یہ حال تھا کہ بعض اوقات لوگ ماہیٔ بے آب ہوکر تڑپتے اور چیخیں مارتے تھے۔ اس جلسہ سے علامہ اقبالؒ، سر شیخ عبدالقادرؒ مدیر ''مخزن'' مولانا ظفر علی خاںؒ، مولانا مفتی محمد عبداللہ ٹونکیؒ اور مولانا عبدالحکیم کلانوریؒ نے خطاب کیا۔

حضرت علامہ اقبالؒ نے اپنے ولولہ انگیز خطاب میں فرمایا کہ:

''جلسے صرف تماشا نہیں بلکہ قومیت کو مضبوط کرنے اور اگلی اور پچھلی قوم کی شخصیت کو ایک کرنے کے لئے ان کا ہونا بہت ضروری ہے۔ جب تک ساری قوم اپنے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم اور اپنے بزرگوں کے حالات سن کر خود ان عظیم الشان ہستیوں کی ذرّیت ہونے کا فخر اور گھمنڈ دل میں پیدا نہ کرے، تب تک ان کے سینوں میں اولوالعزمی اور بلند حوصلگی جوش زن نہیں ہوسکتی۔''[1]

☆

علامہ اقبالؒ کو بزرگانِ دین، اولیائے کرام اور اہل اللہؒ سے بھی خصوصی عقیدت ومحبت تھی، ان کا خیال تھا کہ تمام ایسے اوصاف ومحاسن جو اخلاقی پہلو سے انسانیت کا خاصہ ہیں، محض انہی بزرگوں کی تعلیم وتربیت اور فیوض وبرکات کا نتیجہ ہیں۔ چنانچہ ''بانگ درا'' میں اپنی اس عقیدت ومحبت کا یوں اظہار کرتے ہیں ؎

چھپایا حُسن کو اپنے کلیم اللہ سے جس نے	وہ ناز آفریں ہے جلوہ پیرا نازنینوں میں!
جلاسکتی ہے شمعِ کشتہ کو موجِ نفس اُن کی	الٰہی! کیا چھپا ہوتا ہے اہلِ دل کے سینوں میں؟
تمنا دردِ دل کی ہو تو کر خدمت فقیروں کی	نہیں ملتا یہ گوہر بادشاہوں کے خزینوں میں
نہ پوچھ ان خرقہ پوشوں کی، ارادت ہو تو دیکھ ان کو	یدِ بیضا لئے بیٹھے ہیں اپنی آستینوں میں
ترستی ہے نگاہِ نارسا جس کے نظارے کو	وہ رونق انجمن کی ہے انہیں خلوت گزینوں میں

کسی ایسے شرر سے پھونک اپنے خرمنِ دل کو　　　　کہ خورشیدِ قیامت بھی ہو تیرے خوشہ چینوں میں

☆

حضرتِ علامہ، اولیاء اللہ کی کرامتوں کے بھی قائل تھے اور پیر و مرشد کی ضرورت کو بھی تسلیم کرتے تھے کہ اس کے بغیر انسان کوئی صحیح راستہ اختیار نہیں کرسکتا۔ کہتے تھے کہ:

> ''روحانی فائدہ تو ان بزرگوں سے صرف ان ہی لوگوں کو ہوگا جو اہلِ دل ہیں، جن کے دل میں درد ہے، جن کے قلب میں گرمی اور جن کی روح میں تڑپ ہے۔ لیکن کم سے کم اخلاقی فائدہ تو ہر مرید حاصل کرسکتا ہے۔ پیر کی صحبت سے (بشرطیکہ دکان داری نہ کرتا ہو) ہر مرید اپنا اخلاق سنوار سکتا ہے۔ اور جس کا اخلاق درست ہے، جن کے افعال ٹھیک ہیں اور جس کے اعمال، اعمال حسنہ کہے جاتے ہیں، اس سے بڑھ کر اور کون بہترین انسان ہوسکتا ہے۔''[۱]

☆

اس میں کسی شک و شبہ کی گنجائش نہیں کہ اقبالؒ ایک صوفی خاندان سے تعلق رکھنے اور اولیائے کرام اور صوفیائے عظام سے دلی عقیدت و ارادت رکھنے کے باوجود ایسے صوفیوں اور پیروں سے سخت متنفر تھے جو روحانیت میں ترقی کرنے کے بجائے اپنا پیشہ گردادری بلکہ گداگری بنالیتے ہیں اور اپنے مریدوں پر سالانہ ٹیکس لگا کر ان کا خون چوستے ہیں۔ وہ دوسروں کو تو یہ تعلیم دیتے ہیں کہ دنیا مردار ہے، کافروں کے لئے ہے، مومنوں کو عیش و راحت بہشت میں ملے گی لیکن خود دنیا طلبی میں مبتلا ہوکر محل کھڑے کرتے ہیں، عالی شان عمارتیں بنواتے ہیں اور جائیدادیں خریدتے ہیں۔ چنانچہ حضرت علامہؒ کے کلام میں جا بجا اس قسم کے اشارے پائے جاتے ہیں۔

ہم کو تو میسر نہیں مٹی کا دیا بھی
گھر پیر کا بجلی کے چراغوں سے ہے روشن[۲]

اٹھا میں مدرسہ و خانقاہ سے غمناک
نہ زندگی نہ محبت نہ معرفت نہ نگاہ[4]

اوراس کی وجہ یہ تھی ۔

صوفی کی طریقت میں فقط مستیٔ احوال ملا کی شریعت میں فقط مستیٔ گفتار
شاعر کی نوا مردہ و افسردہ و بے ذوق افکار میں سرمست نہ خوابیدہ نہ بیدار!
وہ مردِ مجاہد نظر آتا نہیں مجھ کو ہو جس کے رگ و پے میں فقط مستیٔ کردار![5]

''شرابِ الست'' بے عملی کا بہانہ بنی اور مسلمان یہ کہہ کر قسمت کا لکھا ہی ایسا تھا، زندگی کی کشمکش سے بھاگ کھڑا ہوا اور جمود وخمود نے اس کے قوائے عمل پر اپنا تسلط جمالیا۔

مجاہدانہ حرارت رہی نہ صوفی میں بہانہ بے عملی کا بنی شرابِ الست!
فقیہہ شہر بھی رہبانیت پہ ہے مجبور کہ معرکے ہیں شریعت کے جنگِ دست بدست!
گریز کشمکش زندگی سے مردوں کی اگر شکست نہیں ہے تو اور کیا ہے شکست![6]

نتیجہ یہ ہوا کہ جس قرآن پاک کی تعلیم نے مسلمانوں کو مہ و پروین کا امیر بنا چھوڑا تھا، اب اسی قرآن مجید سے ترکِ جہاں کی تعلیم اخذ کی جارہی ہے۔

اسی قرآں میں ہے اب ترکِ جہاں کی تعلیم جس نے مومن کو بنایا مہ و پرویں کا امیر!
تن بہ تقدیر ہے، آج ان کے عمل کا انداز تھی نہاں جن کے ارادوں میں خدا کی تقدیر!
تھا جو ناخوب، بتدریج وہی، خوب ہوا کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر![7]

غرض اقبال کی نظر میں مسلمان خود اپنے کو اور اپنے خدا کو فریب دے رہا ہے۔

خبر نہیں کیا ہے نام اس کا خدا فریبی کہ خود فریبی
عمل سے فارغ ہوا مسلماں بنا کے تقدیر کا بہانہ[8]

☆

خیر یہ باتیں تو محض اضافی حیثیت رکھتی ہیں، مقصدِ بیان یہ ہے کہ حضرت علامہؒ نے اپنے دوست منشی محمد دین فوق مدیر ''اخبار کشمیری'' لاہور سے کئی دفعہ کہا کہ:

''اس قسم کا کوئی رسالہ جاری کریں، جس سے فرقہ صوفیاء کی کوئی اصلاح ہو سکے کہ ان کی غلط تعلیم نے مسلمانوں کو مردہ دل بنا دیا ہے۔ وہ مسلمانوں کے سامنے ایسا اسلام پیش کرتے ہیں، جس پر صدہا غلاف چڑھے ہوئے ہیں۔ جب یہ لوگ خود ہی اسلام کی روح سے واقف نہیں تو اپنے مریدوں کو کیا خاک تعلیم دیتے ہوں گے۔ ان کو راہِ راست پر لانے اور ان میں عشقِ الٰہی کی گرمی پیدا کرنے کی سخت اور اشد ضرورت ہے۔''

فوقؔ صاحب نے اپنی مجبوریاں ظاہر کیں کہ مجھے ہفتہ وار ''اخبار کشمیری'' سے ہی فرصت نہیں ملتی۔ پھر یہ طبقہ ایسا ہوشیار ہے کہ وہ رسالے کے مضامین دیکھ کر ہوا کا رخ پہچان لے گا اور اسے ہاتھ بھی نہیں لگائے گا۔

حضرت علامہ نے کہا کہ:

''اس کا علاج نہایت سہل ہے۔ شوگر کوٹڈ گولیاں مضامین لکھئے۔ گڑ میں زہر ملا کر دیجئے اور اپنے آپ کو بالکل ان کا ہمدرد اور عقیدتمند ظاہر کر کے اس کام کو ہاتھ لگائیے۔ پھر یہ آپ کی بات سنیں گے اور آپ کے مشورے بھی قبول کریں گے۔ اس طرح کچھ خدمت بھی ہو جائے گی اور اصلاح کا مقصد بھی پورا ہو جائے گا۔''

چنانچہ فوقؔ صاحب قائل ہو ہی گئے اور اگست ۱۹۱۴ء میں انہوں نے رسالہ ''طریقت'' جاری کر دیا، جس کے پہلے شمارے میں ''تصوف'' کے بارے میں اقبالؒ کا بڑا اہم انٹرویو تھا۔[9]

حضرت امیر ملّت علیہ الرحمہ تو اس سے بہت پہلے ''اصلاحِ صوفیہ'' کی خاطر ۱۹۰۴ء میں لاہور سے ماہنامہ ''انوار الصوفیہ'' کا اجراء فرما چکے تھے، جس کے مقاصد میں ''صحیح تصوف کی ترویج'' اور ''اصلاحِ صوفیہ'' کا کام سرفہرست تھا۔ اور اس مقصد کے حصول کے لئے آپ اپنی تمام تر مساعی بروئے کار لا رہے تھے۔ اور ان کی زبردست خواہش تھی کہ اور لوگ بھی اس

قصد اور اہم مشن کی تکمیل کے لئے میدان عمل میں اتریں اور ''صوفیہ خام'' اور ''تصوف تمام'' کا قلع قمع کر دیں۔[10]

رسالہ ''طریقت'' کی علمی حیثیت چونکہ بہت بلند تھی، اس لئے ملک کے گوشے گوشے میں اس کی پذیرائی ہوئی۔ حضرت امیر ملتؒ نے سب سے پہلے اور سب سے بڑھ کر حضرت اقبالؒ کے اس محبوب و مرغوب پرچے کا خیر مقدم کیا۔ خود خریدار بنے، فوقؔ صاحب کو اپنی جیب خاص سے بار ہا گرانقدر مالی امداد دی۔ اور پنجاب، حیدر آباد دکن، کشمیر اور میسور سے بالخصوص اور تمام برصغیر سے بالعموم آپ کے ''یارانِ طریقت'' نے معقول امداد دی جس سے رسالہ کو مالی پریشانیوں کا کوئی خوف و خطر نہ رہا۔

حضرت امیر ملتؒ کی پیروی کرتے ہوئے آلو مہار شریف ضلع سیالکوٹ، آوان شریف ضلع گجرات، چشتیاں ضلع بہاولنگر، تونسہ شریف ضلع ڈیرہ غازی خاں اور کپورتھلہ (حال مشرقی پنجاب، بھارت) کے اہلِ دل حضرات نے بھی کافی خریدار مہیا کئے۔[11]

غرض تھوڑے ہی عرصے میں اس رسالے کی اشاعت دو ہزار تک پہنچ گئی۔ عام لوگوں نے بھی اس کو پسند کیا اور ہندو بھی خاصی تعداد میں اس کے خریدار بنے۔ اقبال اپنے لگائے ہوئے پودے کو پھلتا پھولتا دیکھ کر بہت خوش ہوئے۔ فوقؔ صاحب اپنے کاموں میں مصروف رہنے کے باعث کچھ عرصہ حضرت علامہؒ کی ملاقات کو نہ جا سکے۔ تو اس پر علامہؒ نے انہیں خط لکھا:

ڈیر فوقؔ!

......آپ کبھی ملتے ہی نہیں۔ اب تو آپ ''پیر طریقت'' بھی بن گئے۔ خدا کرے جلد حافظ جماعت علی شاہ صاحب کی طرح آپ کے ورودِ کشمیر کے متعلق اطلاعیں شائع ہوا کریں۔ والسلام

۲۳۔ جولائی ۱۹۱۵ء آپ کا خادم

محمد اقبال[12]

حضرتِ علامہؒ کے اس خط سے مندرجہ ذیل باتیں سامنے آتی ہیں:

(۱) حضرت علامہؒ کے دل میں حضرت امیر ملّتؒ کا بے حد احترام تھا۔

(۲) حضرت علامہؒ، ان کی سرگرمیوں کو بنظرِ استحسان دیکھتے تھے۔

(۳) حضرت علامہؒ، حضرت امیر ملّتؒ کے تبلیغی و روحانی دوروں میں دلچسپی رکھتے تھے اور باخبر بھی رہتے تھے۔

(۴) حضرت علامہؒ کا حضرت امیر ملّتؒ سے متاثر ہونا، حضرت امیر ملّتؒ کی عظمت، بزرگی اور بلند مقام پر فائز ہونے کی روشن دلیل ہے۔

☆

اگرچہ اقبالؒ ''سلسلہ قادریہ'' میں بیعت تھے مگر انہیں دوسرے سلسلوں کے بزرگوں سے بھی غایت درجہ عقیدت و محبت تھی۔ حضرت امیر ملّت قدس سرہ العزیز کی صحبتِ فیض اثر کی بنا پر ''سلسلہ عالیہ نقشبندیہ'' کے بزرگوں سے تو انہیں خصوصی ارادت تھی۔ حضرت خواجہؒ خواجگان سیّد محمد بہاء الدین نقشبند بخاری رحمۃ اللہ علیہ اور آفتابِ ہند امام ربانی قندیلِ نورانی حضرت مجدّد الف ثانی نور اللہ مرقدہ، سے ان کی محبت اور عقیدت انتہاء تک پہنچی ہوئی تھی، جیسا کہ ۱۳۔ نومبر ۱۹۱۷ء کے ایک خط میں سیّد سلیمان ندوی کو لکھتے ہیں:

''خواجہ نقشبند اور مجدّد سرِ ہند کی میرے دل میں بڑی عزت ہے۔''[۱۳]

یہی وجہ تھی کہ حضرت علامہ نے اپنے بیٹے جاوید اقبال کی پیدائش کے موقعہ پر عہد کیا تھا کہ جب جاوید ذرا بڑا ہوگا تو اسے حضرت امام ربانی مجدّد الف ثانی قدس سرہ النورانی کے مزار پُر انوار پر حاضری کے لئے لے جاؤں گا۔ چنانچہ ۲۹۔ جون ۱۹۳۴ء کو سرہند شریف، جاوید اقبال کو لے کر گئے اور ۳۰۔ جون کو واپس تشریف لے آئے۔ ۳۔ جولائی کے ایک خط لکھتے ہیں:

''مزار نے میرے دل پر بہت اثر کیا۔ بڑا پاکیزہ مقام ہے۔ پانی اس کا سرد و شیریں ہے۔ سرہند کے کھنڈر دیکھ کر مجھے مصر کا قدیم شہر

فسطاط یاد آگیا جس کی بنا حضرت عمرو بن عاصؓ نے رکھی تھی۔ اگر
کھدائی ہو تو معلوم نہیں اس زمانے کی تہذیب و تمدن کے متعلق کیا
کیا انکشاف ہوں۔ یہ شہر فرخ سیر کے زمانے تک بحال رہا اور
موجودہ لاہور سے وسعت اور آبادی میں دگنا" [۱۴]

اقبالؒ کئی بار سرہند شریف حاضر ہوئے اور فیوض باطنی سے مالا مال ہو کر واپس آئے
اور ہر دفعہ اپنے تاثرات و مشاہدات سے احباب کو مطلع کیا۔ پھر "بال جبریل" کی ایک نظم
میں قلبی واردات و تاثرات اور حضرت مجدد قدس سرہ العزیز کے کارناموں کا ایجاز و اختصار
کے ساتھ ذکر کیا، اس نظم کا عنوان ہے، "پنجاب کے پیرزادوں سے۔" گویا یہ نظم خانقاہ نشینوں
کے لئے "درسِ طریقت" ہے۔ فرماتے ہیں:

حاضر ہوا میں شیخِ مجددؒ کی لحد پر — وہ خاک کہ ہے زیرِ فلک مطلعِ انوار
اس خاک کے ذروں سے ہیں شرمندہ ستارے — اس خاک میں پوشیدہ ہے وہ صاحبِ اسرار
گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے — جس کے نفسِ گرم سے ہے گرمیٔ احرار
وہ ہند میں سرمایۂ ملت کا نگہباں — اللہؐ نے بروقت کیا جس کو خبردار
کی عرض یہ میں نے کہ عطا فقر ہو مجھ کو — آنکھیں مری بینا ہیں و لیکن نہیں بیدار
آئی یہ صدا سلسلۂ فقر ہوا بند — ہیں اہلِ نظر کشورِ پنجاب سے بیزار
عارف کا ٹھکانا نہیں وہ خطہ کہ جس میں — پیدا کلۂ فقر سے ہو طرۂ دستار

باقی کلۂ فقر سے تھا ولولۂ حق
طرّوں نے چڑھایا نشۂ خدمتِ سرکار، [۱۵]

☆

اقبالؒ کے معاصرین میں حضرت امیر ملت رحمہ اللہ علیہ کی ذاتِ ستودہ صفات کئی لحاظ
سے ممتاز اور بے مثال تھی۔ حضرت امیر ملت قدس سرہ العزیز بیک وقت میدانِ "شریعت و
طریقت"، "ادب و سیاست" اور "حقیقت و معرفت" کے شہسوار تھے، اور قومی و ملی کارنامے

سرانجام دینے میں عدیم النظیر تھے۔ غرض آپ کی نابغۂ روزگار اور عبقری شخصیت، حضرت مجدد الف ثانی علیہ الرحمہ کی صحیح معنوں میں جانشین اور مسند آراء تھی۔ آپ کے فقر کی اصل ''حجازی'' تھی اور آپ کا ''آستانہ'' شہنشاہوں کے دربار سے ارفع و اعلیٰ تھا ؎

دربارِ شہنشہی سے خوشتر
مردانِ خدا کا آستانہ!

؎ ہمت ہو اگر تو ڈھونڈ وہ فقر جس فقر کی اصل ہے حجازی
اس فقر سے آدمی میں پیدا اللہ کی شانِ بے نیازی! [۱۶]

☆

چونکہ اقبالؒ خود ایسے فقر کی تلاش میں تھے جس کی اصل ''حجازی'' ہو، وہ ''عجمیت'' کے نہیں ''حجازیت'' کے عاشق تھے۔ اور جہاں جہاں ان کو ''حجازیت'' کے آثار نظر آتے تھے وہ بسر و چشم اور بصد شوق اس طرف جاتے تھے۔ ان کے نزدیک ''عجمیت''، ''سکونی'' (STATIC) ہے اور ''حجازیت''، ''حرکی'' (DYNAMIC) ہے۔ چنانچہ ''حجازیت'' کا یہ عاشق کبھی شہنشاہِ مشکلکشا خواجہ نقشبندؒ سے استفادہ کرتا ہے، کبھی سرمایۂ ملتِ ہند حضرتِ مجددؒ کے مزارِ اقدس پر بوسہ زن ہوتا ہے اور کبھی اپنے اس پاکیزہ ذوق کی آبیاری کے لئے خواجہ نقشبندؒ اور مجدد سرہندؒ کے نائب اور مجددِ عصر حضرت امیر ملتؒ کے قدموں میں بیٹھتا ہے۔

☆

چونکہ اقبالؒ کی چشم بینا، حضرت امیر ملت رحمۃ اللہ علیہ کے مقام و مرتبہ سے بخوبی آگاہ تھی لہٰذا انہوں نے حضرت اقدس سے مستفید ہونے کے لئے کوئی دقیقہ فروگزاشت نہیں کیا۔ ایک دفعہ (۱۹۳۷ء) کا ذکر ہے کہ:

''انجمن حمایت اسلام لاہور'' کے ایک بہت بڑے جلسۂ عام میں علامہ ذرا دیر سے پہنچے۔ کرسیاں بھر چکی تھیں، فرش پر بھی لوگ بیٹھے

ہوئے تھے۔ حضرت امیر ملت ؒ کرسی صدارت پر جلوہ افروز تھے۔
حضرت علامہ ؒ آکر حضرت امیر ملت ؒ کے قدموں میں بیٹھ گئے اور
کہنے لگے:

''اولیاء اللہ کے قدموں میں جگہ پانا موجبِ فخر ہے۔''

حضرت امیر ملت ؒ نے تبسم فرمایا اور ارشاد کیا:

''اور اقبال جس کے قدموں میں آجائے اس کے فخر کا کیا
ٹھکانا!''[17]

چونکہ حضرت علامہ ؒ، مردم شناس اور ذہین شاعر تھے، لہٰذا اسی وقت
یہ شعر موزوں پڑھا:

سر رکھ کے تیرے پاؤں پر کہتا ہے اقبال
ٹھوکر سے تری پیدا ہوں اقبال ہزاروں[18]

☆

پاکستان کے نامور محقق، ادیب اور ناقد ڈاکٹر فرمان فتح پوری اپنے ایک مضمون ''تصانیفِ اقبال پر مبصرانہ نظر'' میں لکھتے ہیں:

''قرآن و رسالت کے حوالے سے اقبال کو ہر ایسی چیز اور ہر ایسی
شخصیت سے والہانہ محبت تھی جو اسلام اور اس کے اصولوں سے
متصادم اور متخالف نہ ہو، چنانچہ علماء اور فقراء کی ان کے دل میں
بڑی قدر و منزلت تھی اور صوفیائے کرام اور برگزیدہ شخصیتوں کا وہ
بڑا احترام کرتے تھے۔ ایک دفعہ مجمع میں وہ پیر جماعت علی شاہ
محدث علی پوری کے سامنے فرش پر بیٹھ کر کہنے لگے کہ:

''اولیاء اللہ کے قدموں میں جگہ پانا موجبِ سعادت ہے۔''

اہل اللہ سے یہی وہ عقیدت تھی جس کے سبب وہ بزرگوں کے

مزارات پر حاضری دینا اور فاتحہ پڑھنا ضروری سمجھتے تھے۔ انگلستان جاتے وقت حضرت نظام الدین اولیاءؒ کے مزار پر بطورِ خاص حاضری دی اور ''التجائے مسافر'' کے نام سے دعائیہ نظم کہی۔ اسی طرح ڈاکٹر جاوید اقبال کو بچپن میں وہ شیخ احمد سرہندیؒ کے مزار پر لے گئے اور فاتحہ خوانی کی۔ یہی نہیں، بیرون ملک بھی اقبالؒ جہاں گئے، مسلمان بزرگوں کی زیارت کو ضروری جانا۔ علامہ سلیمان ندوی کے نام اقبالؒ کے بعض خطوں سے پتہ چلتا ہے کہ وہ بیعت کے قائل تھے۔ اور بقول پیر جماعت علی شاہؒ خود بھی سلسلہ قادریہ میں اپنے والد سے بیعت تھے۔''[۱۹]

☆

''صوفیائے کرام'' اور ''تصوف'' پر گہری نظر رکھنے والے حکیم سیّد امین الدین احمد لاہوری اپنی کتاب مستطاب ''صوفیائے نقشبند'' میں رقمطراز ہیں کہ:

''ایک مرتبہ حضرت (امیر ملتؒ) انجمن حمایت اسلام لاہور کے جلسہ کی صدارت کر رہے تھے۔ علامہ اقبال مرحوم آئے اور آپ کے قدموں میں بیٹھ گئے اور کہا کہ:

''بزرگوں کے قدموں میں بیٹھنا سعادت ہے۔''

پیر صاحب نے فرمایا:

''ڈاکٹر صاحب! آپ کا یہ شعر ہمیں بھی یاد ہے۔

کوئی اندازہ کر سکتا ہے اس کے زورِ بازو کا
نگاہِ مردِ مومن سے بدل جاتی ہیں تقدیریں

یہ شعر پڑھ کر آپ نے کہا کہ:

''لوگ نگاہِ مردِ مومن اور تقدیر کے قائل ہو گئے ہیں۔''

اس پر علامہ اقبال مرحوم نے کہا:

''میری نجات کے لئے یہی کافی ہے کہ آپ کو میرا یہ شعر یاد ہے۔''

امیر ملت پیر جماعت علی شاہؒ کی علامہ اقبال مرحوم کے دل میں جو قدر و منزلت تھی، انہوں نے اس کا اظہار ''ضربِ کلیم'' میں ''مردِ بزرگ'' کے عنوان سے ایک قطعہ میں کیا ہے ؎

اس کی نفرت بھی عمیق، اس کی محبت بھی عمیق!
قہر بھی اس کا ہے اللہ کے بندوں پہ شفیق!
انجمن میں بھی میسر رہی خلوت اس کو
شمعِ محفل کی طرح سب سے جدا سب کا رفیق!
مثلِ خورشیدِ سحر فکر کی تابانی میں
بات میں سادہ و آزادہ معانی میں دقیق!
اس کا اندازِ نظر اپنے زمانے سے جدا
اس کے احوال سے محرم نہیں پیرانِ طریق!

حضرت پیر صاحب بھی علامہ اقبالؒ پر بے حد شفقت فرماتے تھے۔ وصال سے پہلے اقبالؔ کا یہ شعر آپ کی زبان پر جاری رہتا تھا۔

تری بندہ پروری سے مرے دن گزر رہے ہیں
نہ گلہ ہے دوستوں کا نہ شکایتِ زمانہ [20]

☆

سلیم تمنائی میسوری لکھتے ہیں کہ ایک دفعہ:

''حضرت سید جماعت علی شاہ نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ نے حضرت اقبالؒ کا ذکر کرتے ہوئے فرمایا:

بھائی سنو! ایک مرتبہ میں لاہور میں تھا۔ اقبالؔ میرے پاس تشریف لائے اور انہوں نے میرے قدم چومے، تو میں نے کہا:

بھائی! جب اقبالؔ خود میرے قدم چوم رہا ہو تو میرے پاس کس چیز کی کمی ہو سکتی ہے۔''

یہ کہہ کر میں نے انہیں گلے لگالیا اور کہا:

''اقبالؔ صاحب! آپ نے ہزاروں شعر کہے ہیں جنہوں نے ملّتِ اسلامیہ کے مردہ دلوں میں زندگی پیدا کر دی ہے۔ مگر بھائی! مجھے تو تمہارا یہ شعر بہت پسند ہے۔ میں اکثر پڑھتا ہوں اور ہر وقت ایک نئی لذت محسوس کرتا ہوں۔''

یہ کہہ کر میں نے یہ شعر پڑھا۔

میں نے سو گلشنِ جنّت کو کیا اس پہ نثار
دشتِ یثرب میں اگر زیرِ قدم خار آیا

علامہ موصوف نے اسے سن کر کہا:

''میری یہ خوش طالعی ہے کہ میرے اشعار حضور کو پسند ہیں، اسے میں اپنے لئے وجہ ناز اور ذریعہ نجات سمجھتا ہوں۔'' [۲۱]

حیدر آباد دکن کے نواب مرزا ذوالفقار علی بیگ جماعتی مرحوم اس پر اضافہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں کہ:

''اس پر علامہؒ نے اپنے ہاتھ حضرت امیر ملّتؒ کے پاؤں مبارک کی طرف بڑھائے مگر حضرت نے جلدی سے علامہؒ کا ہاتھ پکڑ کر کھینچا اور اپنے پاؤں چھونے سے منع فرمادیا۔ تب حضرت علامہ نے حضرت امیر ملّتؒ کا دستِ مبارک اپنے دونوں ہاتھوں میں لے کر بوسہ دیا۔''

''حضرت امیر ملّتؒ کو علامہؒ کا یہ شعر بھی پسندِ خاطر عاطر تھا:

رُخِ مصطفیٰؐ ہے وہ آئینہ کہ ایسا دوسرا آئینہ
نہ نگاہِ آئینہ ساز میں نہ دکانِ آئینہ ساز میں'' [۲۲]

☆

گزشتہ صفحات میں ذکر کیا جا چکا ہے کہ حضرت علامہ کا سلسلہ ''قادریہ'' تھا اور وہ ''نسبت بیعت'' کے قائل تھے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ حضرت علامہ کی بیعت کہاں تھی۔ بعض حضرات نے ان کی بیعت حضرت قاضی سلطان محمودؒ آف اعوان شریف (گجرات) سے ثابت کرنے کی کوشش وسعی کی ہے لیکن کوئی ٹھوس ثبوت پیش نہیں کر سکے۔ کئی حضرات کا خیال ہے کہ وہ نسبتِ بیعت نہیں رکھتے تھے۔ اس سلسلہ میں ہم کچھ تحقیقی حوالے نقل کرنا ضروری سمجھتے ہیں:

اقبالؔ کے سب سے پہلے سیرت نگار پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر فاروقی مرحوم جن کی کتاب ''سیرتِ اقبال'' جنوری ۱۹۳۹ء میں لاہور سے منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوئی، وہ لکھتے ہیں:

> ''عرصہ تک اس امر کا کسی کو علم نہ تھا کہ علامہ کسی سلسلہ تصوف سے وابستہ بھی تھے یا نہیں۔ عام طور پر خیال کیا گیا تھا کہ مرحوم ایسی کوئی نسبت نہ رکھتے تھے لیکن سب سے پہلے اس راز کی عقدہ کشائی امیر ملت اعلیٰ حضرت پیر سیّد جماعت علی شاہ صاحب قبلہ محدث علی پوری رحمۃ اللہ علیہ نے مئی ۱۹۳۵ء میں فرمائی تھی۔ حضرت نے ارشاد کیا کہ: ''اقبال نے رازداری کے طور پر مجھ سے کہا تھا کہ میں اپنے والدِ مرحوم سے بیعت ہوں۔''
>
> حضرت فرماتے ہیں کہ
>
> ''اقبال کے والد کے پاس ایک مجذوب صفت درویش آیا کرتے تھے، وہ انہی سے بیعت تھے۔ ان کا سلسلہ قادریہ تھا''[۲۳]

☆

اقبالؒ کے ایک اور سوانح نگار عبدالمجید سالک کا بیان بھی ملاحظہ ہو:

> ''پیر جماعت علی شاہ صاحب علی پوریؒ نے مئی ۱۹۳۵ء میں بیان کیا

کہ اقبال نے رازداری کے طور پر مجھے کہا تھا کہ میں اپنے والد مرحوم سے بیعت ہوں۔ اقبال کے والد کے پاس ایک مجذوب صفت درویش آیا کرتے تھے، وہ انہی سے بیعت تھے۔ ان کا سلسلہ قادریہ تھا'' [۲۴]

اس سلسلہ میں حضرت امیر ملتؒ کے نبیرۂ اعظم پیر سیّد اختر حسین علی پوریؒ کی روایت بھی قابل ذکر، قابل توجہ اور قابل صد اعتبار ہے، ملاحظہ ہو:

''حضرت علامہؒ کی علالت کے دوران جب حضرت امیر ملتؒ تیمارداری کے لئے تشریف لے گئے تو حضرت علامہؒ بہت خوش ہوئے اور اپنی بیعت کے بارے میں آپ کو گواہ بنایا۔ حضرت امیر ملتؒ کے الفاظ کچھ یوں ہیں:

''میں ڈاکٹر صاحب کی بیماری میں ان کی عیادت کے لئے گیا تو ڈاکٹر صاحب بہت خوش ہوئے اور کہا کہ: حضرت! آپ گواہ رہیں کہ میں اپنے والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ کا مرید ہوں۔ میں نے ان کے ہاتھ پر بیعت کی ہوئی ہے۔ میرے والد صاحب فلاں بزرگ کے خلیفہ تھے۔''

حضرت سیّد اختر حسینؒ فرماتے ہیں کہ حضرت امیر ملتؒ نے ان بزرگ کا نام بھی لیا تھا مگر مجھے یاد نہیں رہا'' [۲۵]

☆

صاحبزادہ شبیر کمال عباسی سجادہ نشین آستانہ قادریہ عباسیہ گوجرانوالہ بھی رقمطراز ہیں کہ:

''علامہ کی سلسلہ عالیہ قادریہ میں بیعت ان کے والد کے توسل سے تھی۔ علامہ، حضرت پیر سیّد جماعت علی شاہ محدث علی پوری رحمۃ اللہ علیہ کی زبانی اس حقیقت کی نقاب کشائی کرتے ہیں، جس

کو ''سیرتِ اقبال'' صفحہ ۵۹ پر پروفیسر محمد طاہر فاروقی ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

''آج تک اس امر کا کسی کو پتہ نہیں تھا کہ علامہ علیہ الرحمہ کسی سلسلۂ تصوف سے وابستہ بھی تھے یا نہیں۔ عام طور پر خیال کیا جاتا ہے کہ مرحوم ایسی کوئی نسبت نہ رکھتے تھے۔ لیکن اس راز کی عقدہ کشائی اعلیٰ حضرت پیر سید جماعت علی شاہ رحمۃ اللہ علیہ نے فرمائی، حضرت نے فرمایا، اقبال نے رازداری کے طور پر مجھ سے کہا تھا کہ میں اپنے والد سے بیعت ہوں۔''[۲۶]

☆

صاحبزادہ شبیر کمال عباسی صاحب اپنی ایک دوسری کتاب ''روحانیتِ اقبال'' میں بھی ایسے ہی خیالات کا اظہار فرماتے ہیں:

''آج تک اس امر کا کسی کو علم نہیں کہ علامہ کسی سلسلۂ تصوف سے وابستہ بھی تھے یا نہیں۔ عام طور پر خیال کیا گیا ہے کہ مرحوم ایسی کوئی نسبت نہ رکھتے تھے۔ لیکن اس راز کی عقدہ کشائی مئی ۱۹۳۵ء میں اعلیٰ حضرت پیر جماعت علی شاہ صاحب محدّث علی پوری نے فرمائی۔

حضرت نے ارشاد کیا کہ:

''اقبال نے راز داری کے طور پر مجھ سے کہا تھا کہ میں اپنے والد محترم سے بیعت ہوں۔''

حضرت فرماتے ہیں کہ:

''اقبال کے والد کے پاس ایک مجذوب سالک درویش آیا کرتے تھے، وہ انہی سے بیعت تھے۔ ان کا سلسلہ قادریہ تھا۔''[۲۷]

☆

آخر میں ہم اپنے دعوے کی تائید میں حضرت علامہؒ کا وہ ''قطعہ تاریخ'' درج کرتے ہیں جو انہوں نے اپنے والد ماجد کی رحلت پر لکھا اور ان کے والد ماجد کے سنگِ مزار (قبرستان امام صاحبؒ سیالکوٹ) پر کندہ ہے۔ اس قطعہ میں حضرتِ علامہؒ نے اپنے والد ماجد کو اپنا ''مرشد'' ظاہر کیا ہے۔ اس قطعہ کے بعد مزید بحث کی گنجائش باقی نہیں رہتی۔

پدر و مرشدِ اقبال ازیں عالم رفت   ماہمہ راہِ رواں، منزلِ ما ملکِ ابد

ہاتف از حضرتِ حق خواست دو تاریخ ترحیل   آمد آواز ''اثرِ رحمت'' و ''آغوشِ لحد''

۱۳۴۹ھ   ۱۳۴۹ھ [۲۸]

☆

۱۹۲۹ء میں ''غازی علم الدین شہید کیس'' میں حضرت امیر ملتؒ اور حضرت علامہؒ نے ایک ساتھ مل کر بلکہ یک جان ہوکر بھرپور کردار ادا کیا۔ دونوں بزرگوں نے دامے، درمے، قدمے، قلمے، سخنے ''علم الدین ڈیفینس کمیٹی'' کی سرپرستی فرمائی اور ''غازی علم الدین شہید'' کی نماز جنازہ کے موقعہ پر دونوں زاروقطار رو رہے تھے، روتے بھی کیوں ناں کہ خود دونوں بھی عاشقِ رسول (صلی اللہ علیہ وسلم) تھے اور ایک اور عاشق رسول علیہ التحیہ والثناء کا جنازہ ان کے سامنے تھا۔ دونوں کا درد رنگ لا چکا تھا۔ حضرت علامہؒ نے اسی دوران غازی علم الدین کی شہادت کے بارے میں اشکوں سے منہ دھوتے ہوئے فرمایا:

''ہم باتیں ہی بناتے رہے اور دیکھتے ہی دیکھتے ایک ترکھان لڑکا بازی لے گیا۔''

(اسیں گلاں کردے رہے تے ترکھاناں دا منڈا بازی لے گیا)''۔

حضرت امیر ملت رحمۃ اللہ علیہ نے رندھی ہوئی آواز میں ارشاد کیا:

''دولت کا لالچ کیا ہے، نہ میرے دل میں کبھی حکومت کی خواہش پیدا ہوئی، میں کسی دنیاوی حاکم سے آج تک مرعوب نہیں ہوا، حمد و نعت کی وارفتگی میں میری تارِ نفس بجتی رہتی ہے۔ میں نے کسی سے

آگے بڑھ جانے کے متعلق بھی نہیں سوچا، حسد کی آگ سے
خدائے قدوس نے مجھے ہمیشہ محفوظ رکھا ہے۔ مگر ''غازی علم الدین
شہید'' کا حال دیکھ کر میرے دل میں اس آرزو نے انگڑائی لی،
کاش! یہ موت مجھے نصیب ہوتی۔''

غازی شہید کی نماز جنازہ کے وقت حضرت امیر ملتؒ اور حضرت علامہ اقبالؒ کا حال دیدنی تھا۔ حضرت علامہؒ نے پنجابی زبان کے نامور شاعر استاد عشق لہر سے جنازہ کے حسبِ حال ''رباعی'' سنانے کی فرمائش کی جو درج ذیل ہے:

میاں اج دو رنگیاں ویکھیاں نیں نالے غم سانوں نالے عید بھی اے
علم الدین دی ایس بہادری دی سانوں دید بھی اے تے شنید بھی اے
جنت وچ رضواناں نے پچھنائیں کول خط اوہدے تے رسید بھی اے
عشق لہر محمدؐ دا اوہ عاشق غازی مرد بھی اے تے شہید بھی اے

یہ رباعی سن کر حضرت علامہؒ نے وفودِ جذبات میں استادِ عشق لہر کی پیشانی چوم لی اور فی البدیہہ ارشاد فرمایا:

نظر اللہؒ پہ رکھتا ہے مسلمانِ غیور موت کیا شے ہے؟ فقط عالمِ معنیٰ کا سفر!
ان شہیدوں کی دِیت اہل کلیسا سے نہ مانگ قدر و قیمت میں ہے خوں جن کا حرم سے بڑھ کر!
آہ! اے مردِ مسلماں تجھے کیا یاد نہیں حرفِ لَا تَدْعُ مَعَ اللّٰهِ اِلٰهاً آخَرُ!

حضرت امیر ملت قدس سرہ العزیز نے فرمایا:

''میں نے بیت الحرام میں نمازیں ادا کیں، مسجد نبویؐ میں سجدہ
ریزیوں کا لطف بھی اٹھایا، مگر جو کیفیت علم الدین شہید کے
جنازے میں شامل ہو کر ہوئی وہ مجھے کسی اور جگہ نہیں ملی، کیا عجب
ہے کہ خواجہ کل جہاں آقائے مدنی صلی اللہ علیہ وسلم اپنے غلام
کے جنازے میں خود تشریف لائے ہوں۔ اور اغلباً میری اس

کیفیت کا سبب بھی یہی تھا۔"

؎ جہاں سرور میسر تھے جام و مے کے بغیر
وہ میکدے بھی ہماری نظر سے گزرے ہیں

حضرت امیر ملّت رحمۃ اللہ علیہ نے غازی علم الدین شہید کے مقبرہ کی تعمیر کے لئے ایک خطیر رقم بصورت نقدی پیش کی۔ حضرت علامہ رحمۃ اللہ علیہ نے مزار کا ڈیزائن بنانے میں مفید مشورے دیئے اور یوں "شہیدِ محبت" کا مزار تعمیر ہوا۔ [۲۹]

☆

حضرت امیر ملّت قدس سرہ العزیز کے خلیفہ ارشد پیر سید زہیر عاقل شاہی بنگلوریؒ نے "غازی علم الدین شہید" کا قطعہ تاریخ شہادت" کہا اور کیا خوب کہا۔

ہزار آفریں لاکھوں ستائش تجھ پر	تو عشقِ سرورِ عالم میں لے گیا بازی
کیا جو اہلِ بدر نے وہ کام تو نے کیا	نہ کیوں ہو خلد بریں میں تیری سرفرازی
سر اپنا اونچا کیا تیری سرفروشی نے	دلوں میں شمعِ شہادت ہے تیری جانبازی
ہیں تر زباں تیری مدحت میں مُسلمِ دہر	ہوں چینی رومی و ہندی کہ مصری و تاتاری
یہ اک مثال ہے تیری حیاتِ ابدی پر	تھی تیری نعش نکل کر بھی قبر سے تازی
سن شہیدِ محبت یہ یادگار ہے	ہے ہجری عیسوی سالِ شہادتِ غازی

سرِ ادب سے سنایا ہے قدسیوں نے زہیر
"زہے تقاضۂ قسمت"....."شہید ہو غازی" [۳۰]
۱۳۴۸ھ — ۱+۱۹۲۸=۱۹۲۹ء

☆

۱۹۳۵ء میں "مسجد شہید گنج لاہور" کی تحریک کے سلسلہ میں سکھوں نے ننگی تلواروں کا جلوس نکالا اور کہتے تھے کہ مسلمانوں کی گردنیں اڑادیں گے۔ اس پر حضرت علامہؒ نے حضرت امیر ملّتؒ کی خدمت میں عرض کیا کہ:

''شاہ صاحب! آپ گورنر سے کہہ کر مسلمانوں کو بھی تلواریں دلادیں۔''

چنانچہ آپ نے بحیثیت ''امیر ملت'' گورنر سے ملاقات کی اور مسلمانوں کوتلوار رکھنے کی اجازت مل گئی۔ [۳۱]

☆

فروری ۱۹۳۶ء میں حج کو جاتے ہوئے حضرت امیر ملتؒ نے ایڈیٹر روزنامہ ''پیسہ اخبار'' لاہور کو اپنے ایک خط محررہ از بمبئی میں ''تحریک شہید گنج'' کے ضمن میں لکھا کہ:

''مجلس اتحاد ملت'' مندرجہ ذیل حضرات کو اپنے قیمتی مشورے میں شریک و شامل کر کے سہولتِ کار کی خاطر صحیح راہ پیدا کرے۔ (۱) ڈاکٹر سر محمد اقبال، (۲) ڈاکٹر سیّد ظفر الحسن صدر شعبہ فلسفہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ (۳) ڈاکٹر محمد عالم، (۴) خان بہادر شیخ عبدالعزیز (۵) شیخ صادق حسن امرتسری (۶) میر مقبول محمود امرتسری (۷) میر ہدایت اللہ امرتسری [۳۲]

حضرت علامہ کی آخری زندگی فقیرانہ بسر ہوئی۔ تمام شب بیدار رہتے تھے۔ بعد نماز تہجد مناجات میں مشغول ہوجاتے تھے۔ ذہانت کا یہ عالم تھا کہ تازہ اشعار جو اس عالم کیف میں موزوں ہو ہو کر زبان سے نکلتے تھے ان کو طلوع آفتاب کے بعد قلمبند کرادیتے تھے۔ یہ فیض انہیں حضرت امیر ملتؒ کے واسطے سے ''سلسلہ نقشبندیہ مجددیہ سے ملا تھا۔ [۳۳]

☆

۲۱۔ اپریل ۱۹۳۸ء کو حضرت علامہؒ کا وصال پرملال ہوا تو حضرت امیر ملتؒ کو سخت صدمہ ہوا۔ ۱۰۔۱۱/ مئی ۱۹۳۸ء کو آپ کی زیر سرپرستی و زیر صدارت ''انجمن خدام الصوفیہ ہند'' کا ۳۵ واں سالانہ اجلاس علی پور سیّداں ضلع سیال کوٹ میں منعقد ہوا تو ہزارہا فرزندانِ توحید کے سامنے خواجہ محمد کرم الٰہی ایڈووکیٹ سیال کوٹی جنرل سیکرٹری ''انجمن خدام الصوفیہ ہند'' نے

حضرت امیر ملتؒ کے ارشاد پر حضرت علامہؒ کی رحلت کے بارے میں نہایت ہی دردانگیز اور مؤثر تقریر کی۔ تمام حاضرین رنج والم اور درد وغم کی تصویر بنے بیٹھے تھے۔ بعد میں نہایت ہی خشوع وخضوع سے دعائے مغفرت کی گئی۔ دوسرے دن ۱۱۔ مئی کو اجلاس کی آخری نشست میں حضرت امیر ملت قدس سرہ العزیز نے خود تمام حاضرین کو حضرت علامہؒ کے لئے دعائے مغفرت کرنے کا خصوصی حکم دیا اور تمام حاضرین نے دلی درد کے ساتھ دعائے مغفرت کی[۱۲]

☆

حواشی

(۱) ''سبیل الرشاد'' از سید ممتاز علی مطبوعہ لاہور ۱۹۳۵ء صفحہ ۳۴، ۳۵۔، روزنامہ ''نوائے وقت'' لاہور بابت ۲۱۔ اگست ۱۹۹۴ء صفحہ ۳۔

(۲) ''حیاتِ اقبال کی گمشدہ کڑیاں'' از محمد عبداللہ قریشی مطبوعہ لاہور ۱۹۸۲ء صفحہ ۳۵، ۳۶، ۲۸۴، ۲۸۵۔ سہ ماہی ''اقبال ریویو'' کراچی بابت جنوری ۱۹۶۱ء صفحہ ۱۶، ۱۷۔ ''مجالسِ اقبال'' از جعفر بلوچ مطبوعہ لاہور ۲۰۰۲ء صفحہ ۲۷ تا ۲۹۔

(۳) کلیدِ کلیاتِ اقبال (اردو) مرتبہ احمد رضا مطبوعہ لاہور دسمبر ۲۰۰۵ء صفحہ ۴۹۶۔

(۴) ایضاً صفحہ ۳۷۸۔

(۵) ایضاً صفحہ ۵۵۲، ۵۵۳۔

(۶) 〃 〃 ۵۵۱، ۵۵۲۔

(۷) 〃 〃 ۵۲۸۔

(۸) 〃 〃 ۷۴۹۔

(۹) ''حیاتِ اقبال کی گمشدہ کڑیاں'' صفحہ ۲۷۷ تا ۲۸۰۔ ''معاصرین، اقبال کی نظر میں'' از محمد عبداللہ قریشی مطبوعہ لاہور ۱۹۷۷ء ص ۳۳۸ تا ۳۴۱۔

(۱۰) ''سیرتِ امیر ملت'' از سید اختر حسین علی پوری مطبوعہ علی پور سیداں ضلع سیالکوٹ ۱۹۷۵ء صفحہ ۳۵۹ تا ۳۶۱۔

(۱۱) ''حیاتِ اقبال کی گمشدہ کڑیاں'' صفحہ ۲۸۷، ۲۸۸۔

(۱۲) ''حیاتِ اقبال کی گمشدہ کڑیاں'' صفحہ ۲۸۷، ۲۸۸۔ ''دانائے راز'' از سید نذیر نیازی مطبوعہ لاہور

۱۹۷۹ء صفحہ ۱۸۶۔

(۱۳) ''ذکرِ اقبالؒ'' از عبدالمجید سالک مطبوعہ لاہور ۱۹۵۵ء صفحہ ۲۵۵۔ ''اقبال نامہ'' از شیخ عطاء اللہ مطبوعہ اقبال اکادمی لاہور ۲۰۰۵ء صفحہ ۱۱۲۔

(۱۴) ''ذکرِ اقبالؒ'' صفحہ ۱۹۱۔

(۱۵) ''حضرتِ مجدد الف ثانیؒ اور ڈاکٹر محمد اقبالؒ از پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود احمد مطبوعہ سیال کوٹ ۱۹۸۰ء صفحہ ۳۴ تا ۳۹ ... ''معاصرین، اقبال کی نظر میں'' از محمد عبداللہ قریشی مطبوعہ لاہور ۱۹۷۷ء صفحہ ۴۰۰ ... ''بالِ جبریل'' از علامہ اقبال مطبوعہ لاہور ۱۹۴۷ء صفحہ ۲۱۱، ۲۱۲ و

(۱۶) ''ضربِ کلیم'' از حضرت علامہ اقبال مطبوعہ لاہور ۱۹۷۰ء صفحہ ۸۶، ۸۸۔

(۱۷) ''سیرتِ اقبالؒ'' از پروفیسر محمد طاہر فاروقی مطبوعہ لاہور ۱۹۶۶ء صفحہ ۱۰۸ ... ''صوفیہ نقشبند'' از حکیم سیّد امین الدین احمد مطبوعہ لاہور ۱۹۷۳ء صفحہ ۳۵۳ ... ''سیرتِ امیر ملّت'' از سیّد اختر حسین علی پوری ر پروفیسر محمد طاہر فاروقی مطبوعہ علی پور سیداں ضلع سیال کوٹ ۱۹۷۵ء، ص ۴۰۱ ... ''کراماتِ امیر ملّت'' از بخشی مصطفیٰ علی خاں میسوری مطبوعہ کراچی ۱۹۶۵ء، ص ۱۹ ... ''حیاتِ مقدسہ'' از سلیم تمنائی میسوری مطبوعہ میسور (بھارت) ۱۹۷۴ء صفحہ ۳۷۔

(۱۸) ''انوارِ شاہِ جماعت'' (قلمی) جلد سوم از مرزا ذوالفقار علی بیگ جماعتی، حیدر آباد دکن صفحہ ۴۹۴ ......

(۱۹) ماہنامہ ''نگارِ پاکستان'' کراچی بابت اپریل ۲۰۰۶ء صفحہ ۲۶۔

(۲۰) ''صوفیہ نقشبند'' از حکیم سید امین الدین احمد مطبوعہ مقبول اکیڈمی لاہور ۱۹۷۳ء صفحہ ۳۵۳، ۳۵۴۔

(۲۱) ''حیاتِ مقدسہ'' از سلیم تمنائی مطبوعہ میسور (بھارت) ۱۹۷۴ء صفحہ ۳۷ بحوالہ ''تذکرہ شاہِ جماعت'' از مولانا عبدالقادر فیاض بلگوڈی مطبوعہ میسور (بھارت) ۱۹۵۴ء صفحہ ۱۲۳)۔

(۲۲) ''انوارِ شاہِ جماعت'' (قلمی) جلد سوم صفحہ ۴۹۴۔

(۲۳) ''سیرتِ اقبالؒ'' از پروفیسر محمد طاہر فاروقی مطبوعہ قومی کتب خانہ لاہور طبع چہارم ستمبر ۱۹۶۶ء صفحہ ۱۰۳۔

(۲۴) ''ذکرِ اقبالؒ'' از عبدالمجید سالک مطبوعہ بزمِ اقبال لاہور ۱۹۵۵ء صفحہ ۲۴۸۔

(۲۵) ''سیرتِ امیر ملّت'' صفحہ ۱۰۴۔

(۲۶) ''بیعتِ اقبالؒ'' از صاحبزادہ شبیر کمال عباسی مطبوعہ گوجرانوالہ جنوری ۱۹۹۴ء صفحہ ۵۱، ۱۶ بحوالہ ''سیرتِ اقبالؒ'' از پروفیسر محمد طاہر فاروقی مطبوعہ قومی کتب خانہ لاہور طبع اول ۱۹۳۹ء صفحہ ۵۹۔

(۲۷) ''روحانیتِ اقبالؒ'' از صاحبزادہ شبیر کمال عباسی مطبوعہ گوجرانوالہ ۱۹۹۴ء صفحہ ۱۶ تا ۱۸ بحوالہ ''سیرتِ اقبالؒ'' از پروفیسر محمد طاہر فاروقی مطبوعہ لاہور ۱۹۳۹ء ص ۵۹۔

(۲۸) ''حیاتِ اقبال کی گمشدہ کڑیاں'' صفحہ ۳۴..... ''دانائے راز'' از سیّد نذیر نیازی، لاہور ۱۹۷۹ء صفحہ ۲۸۔

(۲۹) ''غازی علم الدین شہید'' از رائے محمد کمال مطبوعہ لاہور ۱۹۸۳ء صفحہ ۸۷، ۹۴، ۱۳۵، ۱۴۰، ۱۴۵، ۱۵۹، ۱۶۰، ۱۶۳، ۱۶۸، ۱۹۱، ۱۹۷، ۲۱۱۔

(۳۰) ''تذکرہ شعرائے جماعتیہ'' از محمد صادق قصوری مطبوعہ بُرج کلاں (قصور) ۲۰۰۶ء صفحہ ۴۷۔

(۳۱) ''انوارِ شاہِ جماعت'' (قلمی) جلد چہارم صفحہ ۴۷۶۔

(۳۲) ماہنامہ ''انوار الصوفیہ'' قصور بابت اپریل مئی ۱۹۶۱ء صفحہ ۶۱ بحوالہ روزنامہ ''پیسہ اخبار'' لاہور بابت ۲۹۔فروری ۱۹۳۶ء۔

(۳۳) ''انوارِ شاہِ جماعت'' (قلمی) جلد سوم صفحہ ۴۹۴۔

(۳۴) ہفت روزہ ''الفقیہہ'' امرتسر بابت ۲۱ تا ۲۸..... اپریل، ۲۸ مئی ۱۹۳۸ء صفحہ ۱، ۱۴..... ماہنامہ ''انوار الصوفیہ'' سیال کوٹ بابت مئی ۱۹۳۸ء صفحہ ۳۳، ۳۴۔

حلقہ بگوشانِ امیرِ ملّتؒ اور اقبالؒ

حکیم فیروز طغرائی امرتسریؒ

حکیم الشعراء حکیم فیروز الدین احمد فیروز طغرائی خلف الرشید میاں شمس الدین ۱۸۸۲ء میں کوچہ وکیلاں امرتسر شہر (مشرقی پنجاب، بھارت) میں ایک جلیل القدر کشمیری خاندان میں پیدا ہوئے۔ محلہ کی مسجد سے قرآن پاک پڑھنے کے بعد امرتسر کے معروف عالم دین مفتی غلام رسول قاسمی، شیخ عبدالرزاق خاکی، حاجی غلام محمد مولوی فاضل، حکیم شمس الدین کاکڑی، ڈاکٹر علامہ حکیم غلام رسول اور منشی شرف الدین سے عربی، فارسی، اردو اور طب میں مہارت حاصل کی۔

حکیم طغرائی نے عربی، فارسی، اردو اور پنجابی میں بھرپور شاعری کی۔ نظم، غزل، نعت، منقبت اور دیگر اصناف سخن پر عبور حاصل تھا۔ پاکستان کے ممتاز دانشور، ادیب اور ماہر اقتصادیات جناب ممتاز حسن کے بقول:

> ''میرا خیال ہے کہ طغرائی صاحب ہر لحاظ سے استادِ فن تھے۔ فارسی غزلوں میں وہ اکثر اپنے اشعار میں ایسی جدّت پیدا کر جاتے ہیں کہ بڑے بڑے استادوں کی یاد دلاتے ہیں۔ زبان پر مکمل قدرت کے نمونے ان کے کلام میں جگہ جگہ ملتے ہیں۔''

☆

فیروز طغرائی نے امیر ملّت حضرت پیر سیّد جماعت علی شاہ محدث علی پوریؒ کے دستِ حق پر بیعت کی تھی اور دل و جان سے اپنے مرشد کے والا وشیدا تھے۔ فنافی الشیخ کے مقام پر

فائز تھے۔ اپنے شیخ کریم سے عقیدت و محبت کے فیض سے عشق رسول صلی اللہ علیہ کی دولتِ لازوال کے حامل تھے۔ مارچ ۱۹۲۳ء میں موضع دسوہہ ضلع ہوشیار پور (حال بھارت) مرزائی مناظر سے آیہ خاتم النبیین کے معانی پر بحث ہوئی۔ مرزائی (قادیانی) مناظر آپ سے عہدہ برانہ ہوسکا اور راہِ فرار اختیار کی۔ سامعین میں سے تیس (۳۰) اصحاب نے مرزائیت سے توبہ کی جن کے نام انہی دنوں اخبار ''وکیل'' امرتسر میں شائع ہوگئے تھے۔

☆

۱۹۱۳ء میں آپ کی بیاض جس میں تین سو سے زائد اردو، فارسی غزلیں تھیں، کسی دزدِ سخن کے ہتھے چڑھ گئی اور اس کا آج تک پتہ نہ چل سکا۔ دیگر تصانیف کی فہرست کچھ یوں ہے:

(۱) شرح قصائد قاآنی (مطبوعہ) (۲) لسان المغیب (مطبوعہ) (۳) شرح دیوانِ غالب، اردو (نامکمل) (۴) شرح غزلیاتِ غالب، فارسی (نامکمل) (۵) کلیاتِ طغرائی (اردو، فارسی مجموعۂ کلام جو زمانہ کی دست برد سے بچ سکا، ۱۹۳۳ء میں لاہور سے آپ کے تلمیذ رشید صوفی غلام مصطفیٰ تبسم نے شائع کیا۔)

☆

آپ کے شاگردوں میں پروفیسر صوفی غلام مصطفیٰ تبسم، حکیم محمد حسین عرشی امرتسری، مولانا غلام محمد ترنم امرتسری ثم لاہوری، پروفیسر ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ ایم اے، پی ایچ ڈی، منشی مولا بخش کشتہ امرتسری، پیر غلام قادر شوکت امرتسری اور پیرزادہ عبدالعزیز مخدومی امرتسری جیسے لوگ شامل تھے۔

آپ درحقیقت امرتسر کے مہر تاباں اور علم و حکمت کا ایسا چشمۂ حیواں تھے، جہاں تک کوئی سکندر نہ پہنچ سکا۔ بڑے بڑے اساتذہ اور اہل کمال نے آپ کا لوہا مانا۔ حکیم الامت علامہ اقبالؒ نے آپ کے بارے میں فرمایا:

''طغرائی امرتسر کا وہ کنواں ہے جس پر آل (ماہل) نہیں ہے۔''

☆

''فیروز طغرائی کی طرز و وضع کی پابندی کا یہ عالم تھا کہ تمام عمر ایک ہی ''لے'' میں ''فریاد'' کی اور اپنے دلگداز ''نالہ'' کو ہمیشہ ''پابندِ نے'' رکھا۔ جن اساتذہ کی نظموں پر نظمیں لکھیں، خیالات، تشبیہات اور انداز بیاں میں ان سے کہیں تو ارد اور تصادم نہیں ہوتا۔ علامہ اقبالؒ کے ''شکوہ'' کے بعد ''شکوۂ اسلام'' لکھا لیکن بجائے اس کے کہ عام شکوہ نویسوں کی طرح اس کا تتبع کرتے، شکوہ اول ہی کو ''شکوہ بیجا'' ثابت کیا۔ تا بہ تقلید او چہ رسد، اور اپنی جوابی نظم میں بتایا کہ ''شکوہ'' یوں ہونا چاہئے تھا:

آسکے گا نہ یہاں شکوۂ بے جا لب پر
سخنِ گرم ہے خود۔ شرم سے چھالا لب پر

ایسے ہی علامہ اقبالؒ کی ''تصویر درد'' کو دیکھ کر ایک اتنی ہی طویل نظم ''تصویر یاس'' کے عنوان سے لکھی، جس میں درد و اثر کے لحاظ سے اپنا دل کھول کر رکھ دیا ہے۔ طوالت کے باوجود کہیں پھیکا پن نہیں۔ ہر بند کے بعد دوسرے بند پر زور ہوتا جاتا ہے۔ الفاظ و معانی قرینے سے مرتب کئے گئے ہیں۔ بعض اشعار سنیئے:

نرالے رنگ سے ہنگامہ آرا ہے زباں میری — نیا انداز رکھتی ہے پرانی داستاں میری
بیان دردِ دل کرتا ہوں میں اشعارِ موزوں میں — عجب سانچے میں ڈھل ڈھل کر نکلتی ہے فغاں میری
گلستانِ جہاں میں نغمہ پیرائے مصیبت ہوں — کرے گی ہمسری کیا عندلیب بوستاں میری

....

عیاں میں آج اپنا سوزِ پنہاں کر کے چھوڑوں گا — جگر کے آبلوں کو آتش افشاں کر کے چھوڑوں گا
ہنساؤں گا ہر اک بیدرد کو میں اپنے رونے پر — ہویدا ارتباط برق و باراں کر کے چھوڑوں گا
زمانے میں دل درد آشنا پیدا نہیں ہوتا — میں اس نایاب شے کو خوب ارزاں کر کے چھوڑوں گا

....

الٰہی تیری ذات ارفع بھی ہے اور ذوالمنن بھی ہے — تصرف میں ترے یہ گردشِ چرخ کہن بھی ہے
تری رحمت سے ہر نخل امل ہوتا ہے بار آور — سحابِ لطف کا امیدوار اپنا چمن بھی ہے
جو تو چاہے تو ہوسکتی ہے تیری معرفت حاصل — کہ یہ راہِ مصائب دور بھی ہے کٹھن بھی ہے

مجھے اے قاضی الحاجات کیا کیا آرزوئیں ہیں　　خیالِ نوعِ انساں بھی، غمِ قوم و وطن بھی ہے

☆

باوجود یکہ آپ یاس وافسردگی اور حزن واندوہ کی مصوری کے لئے برپا کئے گئے تھے، کبھی کبھی نیچرل نظمیں بھی کہہ لیتے تھے اور اپنی قادر الکلامی اور درّاکی وذہانت کے زور پر ان میں بھی استادانہ شان پیدا کر لیتے تھے۔ علامہ اقبالؒ نے ''جگنو'' پر نہایت بلند پایہ نظم لکھی:

جگنو کی روشنی ہے کاشانۂ چمن میں

یا شمع جل رہی ہے پھولوں کی انجمن میں

طغرائی مرحوم نے غالباً اس کو دیکھنے کے بعد بحر بدل کر گلستاں میں ''جگنو'' کی چمک دمک کا سماں دکھلایا ہے۔ نظم کا جسم و روح تمام ان کی اپنی مخلوق ہے جو چیز مستعار نہیں۔ فرماتے ہیں:

چمک دمک ہے گلستاں میں جا بجا کیسی　　لگا رہی ہے چکا چوند یہ ضیا کیسی

یہ سحر ہے کہ فسوں ہے عجب تماشا ہے　　کبھی نظر میں اندھیرا کبھی اجالا ہے

یہ دور دور دیئے کیسے ٹمٹماتے ہیں　　بساطِ سبزہ پہ تارے سے جگمگاتے ہیں

کچھ آج حد سے زیادہ ہے زیب و زینت و فر　　عروسِ باغ نے افشاں چنی ہے ماتھے پر

....

عجب شے ہے یہ چھوٹی سی نور کی قندیل　　دکھائی دیتی ہے جیسے کہ دور کی قندیل

یہاں ہوا کبھی روشن کبھی وہاں چمکا　　فروغِ حسن دکھایا غرض جہاں چمکا

....

فدا ہو اس کی چمک پر کدھر ہے پروانہ　　یہ شمع وہ ہے کہ مرغِ نظر ہے پروانہ

تہِ چراغ اندھیرا جہاں میں ہے مشہور　　یہ وہ چراغ ہے رہتا ہے جس کے نیچے نور

....

گماں ہے اس پہ درگوشِ شاہدِ گل کا،　　جو یہ نہیں تو شرارہ ہے آہِ بلبل کا

دھواں جو آتشِ گل کا سحابِ پرنم ہے　　تو عین برقِ درخشاں کا اس میں عالم ہے

خدا نے کیا ہی بنائے یہ پیکرِ روشن　　بنے ہیں سروِ چراغاں انہی سے سروِ چمن

ہوا گماں جو یہ چمکے کہیں گلوں کے قریں کہ گل رخانِ چمن نے ہیں جگدیاں پہنیں

☆

''۱۹۱۵ء میں مثنوی اسرارِ خودی'' شائع ہوئی تو وجودی تصوف کے حامی صوفیوں، روایتی سجادہ نشینوں اور ان کے ساتھیوں کی اقبالؔ اور اس کے حامیوں کے ساتھ جو قلمی جنگ ہوئی وہ ۱۹۱۸ء تک برپا رہی۔ اس دوران اخباروں اور رسالوں میں بہت سارے مضامین مثنوی ''اسرارخودی'' کی تعریف اور مخالفت میں، وحدت الوجود کے حق میں یا خلاف اور حافظ شیرازیؒ کی حمایت یا ان کے نظریہ کے ابطال میں شائع ہوئے۔ مشائخ عظام میں مصورِفطرت خواجہ حسن نظامی دہلوی اور ان کے مرید اقبالؔ کی مخالفت میں پیش پیش تھے۔ اقبالؒ نے خود اس بحث میں پڑ کر کئی مضامین لکھے۔ ان کے حامیوں اور ساتھیوں میں مولوی سراج الدین پال ایڈووکیٹ، مولانا عبداللہ عمادی، مولانا ظفرعلی خاں، مولوی الف دین وکیل، مولوی محمود علی اور عبدالرحمٰن بجنوری وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ بعض نے اپنے نام مخفی رکھتے ہوئے فرضی ناموں کے تحت مضامین لکھے۔

۱۹۱۴ء میں پہلی بار اقبال نے ''انجمن حمایت اسلام لاہور'' کے سالانہ جلسے میں ''عجمی تصوف اور اسلام'' کے موضوع پر خطبہ دیتے ہوئے وجودی تصوف سے انکار وانحراف کا اعلان کیا تھا۔ انہوں نے فرمایا:

> ''اس (یعنی مروجہ) تصوف کو اسلام کے سادہ عقائد اور عربی روحِ دینی سے کوئی علاقہ نہیں اور اس کا بنیادی ستم یہ ہے کہ یہ خودی کو تباہ کرتا ہے۔ حالانکہ خودی ایک ایسی چیز ہے جو افراد واقوام کی زندگی کی ضامن اور انسان کو بلند ترین مادی و روحانی مدارج پر پہنچانے کی کفیل ہے..... تصوف کے لٹریچر میں جہاں کہیں خودی کو مارنے کا ذکر آیا ہے، وہاں عوام اس کے معنی غرور وتکبر کرتے ہیں، جو رذائل سے ہے اور اس سے ہر مسلمان کو اجتناب کرنا چاہیے لیکن متصوفین

نے یہ لفظ غرور کے معنی میں استعمال نہیں کیا، بلکہ ''احساسِ ذات''
''انا'' اور ''میں'' کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ ان کا مقصد یہ ہے
کہ انسان اپنے آپ کو مٹا دے، اپنے نفس کی نفی کرے، تب
معرفت کی منزل پر فائز ہو سکتا ہے، حالانکہ یہ تصور بالکل خلافِ
اسلام ہے۔ اسلام چاہتا ہے کہ ہر انسان کی خودی نہ صرف قائم
رہے بلکہ ارتقاء کی منزلیں طے کرتے کرتے اس مقام پر پہنچ جائے
جو اس کے لئے مقدر ہے اور جس سے بڑا کوئی مقام انسانی تصور
میں نہیں آسکتا۔''

اسی تقریر کے دوران اقبالؒ نے یہ بھی کہا کہ:

''انہوں نے مثنوی'' اسرار خودی'' کے نام سے ایک مثنوی تحریر کی
ہے جو'' عجمی تصوف'' کے اس طلسم کو پاش پاش کردے گی جس نے
مسلمانوں کو عمل کی قوت سے محروم کر کے ساکت و جامد کر رکھا ہے۔''

اقبالؒ نے مثنوی ''اسرار خودی'' میں جو اشعار حافظؔ کے خلاف لکھے اور جن پر اعتراض ہوا وہ یہ تھے:

ہوشیار از حافظِ صہبا گسار	جامش از زہر اجل سرمایہ دار
رہنِ ساقی خرقۂ پرہیزِ او	مے علاج ہولِ رستاخیزِ او
نیست غیر از بادہ در بازارِ او	از دو جام آشفتہ شد دستارِ او
چوں جرس صد نالۂ رسوا کشید	عیش ہم در منزلِ جاناں ندید
آہ فقیہِ ملت مے خوارگاں	آں امامِ امتِ بے چارگاں
گوسفند است و نوا آموخت است	عشوہ و ناز ادا آموخت است
دلربائی ہائے او زہر است و بس	چشمِ او غارت گرِ شہر است و بس
از بنِ یوناں زمیں زیرک تر است	پردۂ عودش حجابِ اکبر است

بگزر از جامش کہ در مینائے خویش — چوں مریدانِ حسن دارد حشیش
محفلِ اُو درخورِ ابرار نیست — ساغرِ او قابلِ احرار نیست
بے نیاز از محفلِ حافظؔ گزر
الحذر از گوسفنداں الحذر

پورے برصغیر میں یہ قلمی جنگ اقبالؔ کے موافق و مخالف لوگوں کے درمیان جاری رہی۔ حکیم الشعراء حکیم فیروز الدین احمد فیروزؔ طغرائی امرتسریؒ نے بھی اقبالؔ کی مخالفت کی۔ جیسا کہ ڈاکٹر جاوید اقبال لکھتے ہیں:

''حکیم فیروز الدین احمد طغرائیؔ نے حافظؔ (شیرازی) کی حمایت میں ایک رسالہ ''لسان الغیب'' کے نام سے شائع کیا۔ انہوں نے لکھا کہ مثنوی ''اسرار خودی'' کا مطالعہ یاس آفریں ثابت ہوا، کیونکہ اقبال نہ تو اربابِ مشاہدہ میں سے تھے، نہ انہیں طریقِ اظہار میں پختہ کلامی حاصل تھی۔ طغرائیؔ نے کلام حافظؔ میں سے جوش، ولولہ انگیزی، تحریکِ عمل، صبر و استقلال، حزم و احتیاط اور فلسفہ اخلاق کی تعلیم کی مثالیں پیش کرتے ہوئے تحریر کیا کہ اقبالؔ نے حافظ کے ان پہلوؤں کو نظر انداز کر دیا، کیونکہ عرفاء کے رموز و اشارات سمجھنے کے لئے اربابِ حال کی خدمت میں کچھ عرصہ زانوئے ادب تہ کرنے کی ضرورت ہے، جس سے اقبالؔ محروم تھے۔ (زندہ رود صفحہ ۲۸۰۔۲۸۱)

☆

القصہ جب بات حد سے بڑھ گئی اور معاملہ تلخی کا رنگ اختیار کرنے لگا تو حضرت اکبرؔ الہ آبادیؒ نے اقبالؔ اور خواجہ حسن نظامی کو اس بحث کو جاری رکھنے سے روکا۔ دونوں خاموش ہو گئے اور خواجہ حسن نظامی پہلے کی طرح اقبال کی دوستی کا دم بھرنے لگے۔ بعد میں اقبالؒ نے

اگلے ایڈیشنوں میں سے یہ اشعار حذف کر دیئے۔

☆

سرزمینِ پنجاب میں ایک ایسا وقت بھی آیا کہ ۱۹۲۰ء میں ''تحریک ترکِ موالات'' کی وجہ سے ایک سیاسی ہیجان سا پیدا ہو گیا تھا، مدبران قوم اپنے خیالات وارشادات سے قوم کی رہنمائی کر رہے تھے، لیکن حضرتِ اقبالؔ غیر معمولی طور پر خاموش تھے، روزنامہ ''زمیندار'' میں ان کی اس پُرمعنی خاموشی پر بہت سے مضامین اور نظمیں شائع ہوئیں لیکن علامہ موصوف ان سے متاثر نہ ہوئے۔ اس سلسلے میں محمد حسین عرشیؔ امرتسری کی ایک فارسی نظم ''خطاب بہ اقبالؔ'' کے عنوان سے شائع ہوئی، علامہ موصوف نے اس کا جواب نظم میں دیا، جس کا پہلا شعر یہ تھا۔

دانی کہ چیست شیوۂ مستانِ پختہ کار،
عرشیؔ گماں مدار کہ پیمانہ ام شکست

حکیم فیروز طغرائی ان دنوں جموں (حال مقبوضہ کشمیر، بھارت) میں اکبر اسلامیہ ہائی سکول میں معلم تھے، انہوں نے عرشی صاحب کی نظم نہیں دیکھی تھی، صرف اس جواب سے متاثر ہو کر انہوں نے چند اشعار قلم برداشتہ لکھ کر ''زمیندار'' میں اشاعت کے لئے بھیج دیئے۔ مولانا ظفر علی خاں نے عرشی کی نظم، علامہ اقبال کا جواب اور طغرائی کے اشعار اکٹھے شائع کیے، اس پر ایک منظوم محاکمہ بھی کیا۔ طغرائی کے اشعار ملاحظہ ہوں:

امروز در فضائے زمیندارؔ دیدہ ام ۔ ز اقبالؔ پاسخے کہ دلِ آرزو و بخست
نادیدہ خاطرم بخطابِ تو وارسید ۔ نشنیدہ مدعائے تو در ذہنِ من نشت
خواہم کہ نکتۂ بسرایم دریں خصوص ۔ ہر چند غم نوائے نشاطِ مرا شکست
عالم بصد ہزار زباں کنج خامشی است ۔ شاعر درآں میانہ لب نطق پروراست
باشد برائے دیدۂ بینا مقامِ حیف ۔ گر کورو چاہ دید وصدائے نداد دست
گیرم کہ گنج فلسفہ حکمت کس ۔ اماچہ سود مہر سکوت اربش بہ بست

بپذیر اعتذار ز طغرائیِ حزیں
دانی کہ او ز بندِ الم ہیچگہ نرست

☆

مولانا ظفر علی خاں اور حکیم فیروز طغرائی امرتسری کے اصرار کے سامنے علامہ اقبالؒ نے سرِ تسلیم خم کر دیا اور ایک نظم لکھی جس کے تین اشعار حسب ذیل ہیں:

شعلہ در آغوش دارد عشقِ بے پروائے من
بر نخیزد یک شرار از قسمت نازائے من

تیغ لا در پنجۂ ایں کافرِ دیرینہ دہ
باز بنگر در جہاں ہنگامۂ الائے من

بہرِ دہلیزِ تو از ہندوستان آوردہ ام
سجدۂ شوقی کہ خوں گردید در سیمائے من

☆

حکیم فیروز طغرائی کی رحلت ۸۔ فروری ۱۹۳۱ء بروز اتوار صبح کو امرتسر (حال مشرقی پنجاب، بھارت) میں ہوئی۔ آپ کے تلمیذ رشید حکیم محمد حسین عرشی امرتسری نے یہ ''قطعہ تاریخ وفات'' کہا۔

تربتِ فیروز طغرائی کہ باد جلوہ افگن اندرو نورِ خداؒ
جستمش سالِ وفات از عارفی بی تامل گفت ''مغفورِ خداؒ''

......۱۹۳۱ء......

.... ماخذ ....

(۱) ''کلیاتِ طغرائی'' مرتبہ صوفی غلام مصطفیٰ تبسم مطبوعہ لاہور ۱۹۳۳ء متعدد صفحات۔

(۲) ''اوراقِ گم گشتہ'' از پروفیسر رحیم بخش شاہین مطبوعہ لاہور طبع دوم مارچ ۱۹۷۹ء صفحہ ۲۰۰

تا ۲۰۳۔

(۳) ''زندہ رود'' از ڈاکٹر جاوید اقبال مطبوعہ لاہور ۲۰۰۴ء صفحہ ۲۷۲۔

(۴) ''علامہ اقبال سے آخری ملاقاتیں'' از صوفی غلام مصطفیٰ تبسم (مرتبہ صوفی گلزار تبسم) مطبوعہ لاہور ۱۹۸۹ء متعدد صفحات۔

(۵) ''شیدایانِ امیر ملت'' از محمد صادق قصوری مطبوعہ بُرج کلاں (قصور) ۱۹۸۹ء صفحہ ۱۳ تا ۲۹۔

(۶) ''تذکرہ شعرائے جماعتیہ'' از محمد صادق قصوری مطبوعہ بُرج کلاں (قصور) ۲۰۰۶ء صفحہ ۲۵ تا ۳۰۔

(۷) مثنوی اسرار خودی'' از علامہ اقبال مطبوعہ لاہور ۱۹۶۴ء متعدد صفحات۔

جنرل نادر شاہؒ والئ افغانستان

اعلیٰ حضرت جنرل نادر شاہ (ولادت ۱۸۸۰ء، رحلت ۱۹۳۳ء) ۱۹۳۰ء میں بچہ سقہ کو شکست دے کر کابل کے تخت پر بیٹھے۔ اس سے پہلے امیر حبیب اللہ خاں والئ کابل کی فوج میں افسر تھے، ان کے قتل کے الزام میں گرفتار ہوئے لیکن رہا کر دیئے گئے اور یورپ میں پناہ لی۔ ۱۹۲۹ء میں امیر امان اللہ خاں کی شکست کے بعد جب بچہ سقہ نے کابل کے تخت پر قبضہ کیا تو پشاور کی راہ سے افغانستان میں داخل ہوئے اور اعلان کیا کہ امان اللہ خاں کو دوبارہ تخت پر بٹھانے کے لئے جدوجہد کریں گے مگر کابل فتح کرنے کے بعد بوجوہ خود تخت نشین ہو گئے۔ فوج کو از سر نو منظم کیا اور ملک کی اقتصادی صورت حال کو بہتر بنانے کا پروگرام بنایا۔ انہیں افغانستان کا ''نجات دہندہ'' بھی کہا جاتا ہے۔

نادر شاہ نے حضور قبلہ عالم امیر ملت حضرت پیر سیّد جماعت علی شاہ محدث علی پوری رحمۃ اللہ علیہ کی روحانیت کا شہرہ سن کر بارہا دورہ کابل کی دعوت دی مگر حضرت قبلہ اپنی گوناگوں مصروفیات کی بنا پر قبول نہ فرما سکے۔ اکتوبر ۱۹۳۲ء جب دعوت پیش کی گئی تو آپ نے قبول فرمالی اور کوئٹہ، قندھار کے راستے سے کابل تشریف لے گئے۔ جب آپ قندھار پہنچے تو گورنر قندھار کا خط ملا کہ

''میزبانی کے تمام انتظامات مکمل کر کے میں ایک ضروری کام سے شہر سے باہر جا رہا ہوں، کل حاضر خدمت ہوں گا۔''

آپ نے اسی خط کی پشت پر یہ شعر لکھ کر واپس کر دیا۔

غرض از سیرِ قلندر طلبِ دیدار است
ورنہ ایں نان و نمک در ہمہ جابسیاراست

گورنر قندھار یہ پیام پاکر بہت شرمندہ ہوا۔ دورہ موقوف کر کے فوراً حاضر خدمت ہوا۔ اورعرض کیا کہ ''بادشاہ کے سامنے میری اس کوتاہی کا ذکر نہ فرمائیں۔'' دیر تک حاضر خدمت رہا۔غرض اسی طرح منزل بمنزل قیام فرماتے اور تبلیغ وارشاد سے خلقِ خدا کوفیض یاب کرتے ہوئے ۲۵۔ جمادی الثانی ۱۳۵۱ھ مطابق ۲۶۔ اکتوبر ۱۹۳۲ء بروز بدھ کابل پہنچے جہاں آپ کی خدمت میں منظوم سپاس نامہ پیش کیا گیا۔

کابل میں آپ نے کئی دن قیام فرمایا اور نادرشاہ کوحکم دیا کہ کسی کوبھی یہاں آنے سے نہ روکا جائے، تعمیلِ ارشاد ہوئی۔ کثیر التعداد خلقِ خدا نے حاضر ہوکر بیعت کر کے روحانی استفادہ کیا، خود نادرشاہ نے بھی سعادتِ بیعت حاصل کی۔ پہلی شاہی دعوت میں جب آپ شامل ہوئے تو دسترخوان پر چھریاں اور کانٹے وغیرہ موجود تھے۔ اس پر آپ نے نادرشاہ کو متوجہ کر کے ایک پرانا واقعہ سنایا۔ فرمایا کہ:

''میں احرام باندھے ہوئے شریفِ مکہ کی دعوت میں شریک ہوا۔ سب لوگ انگریزی طرز سے چھری کانٹوں سے کھانے لگے، مگر میں سنت کے مطابق ہاتھ سے کھاتا رہا۔ شریف مکہ کے ولی عہد نے میرے معلم سے دریافت کیا کہ ''یہ کون شخص ہے اور کس طرح کھاتا ہے۔'' معلم نے جواب دیا، ''شریف نے خاص طور پر اس شخص کی دعوت کی ہے۔ اصل مہمان تو یہی ہے، ہم سب تو طفیلی ہیں۔''

حضرت قبلۂ عالم امیرملت رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ:

''میں عربی جانتا ہوں۔ یہ گفتگو سن کر میں نے عربی میں کہا، ''میں مسلمان ہوں۔ مسلمان کے گھر میں پیدا ہوا ہوں، اور مسلمانوں کے قبرستان ہی میں دفن ہوں گا۔ مسلمانوں کی طرح سنت کے

مطابق کھانا کھاتا ہوں۔''

شریف مکہ ساتھ بیٹھا ہوا کھا رہا تھا۔ اس نے فوراً چھری کانٹے ہاتھ سے رکھ دیئے اور حکم دیا کہ ''یہ اٹھالو۔ آج کے بعد کبھی دسترخوان پر مت رکھو۔ سب ہاتھ سے کھایا کرو۔''

نادر شاہ نے یہ قصہ سنتے ہی فوراً چھری کانٹے اٹھوا دیئے اور حکم دیا کہ آئندہ کبھی دسترخوان پر نہ لائے جائیں۔''

☆

نادر شاہ نے آپ سے خلوت میں ملاقات کی درخواست کی۔ آپ نے منظور فرمالی۔ چنانچہ سلطنت کے دستور کے مطابق اس خاص ملاقات کا اہتمام قلعہ میں کیا گیا۔ آپ وزیر خارجہ کے ہمراہ قلعہ میں تشریف لے گئے اور کمرۂ شاہی میں نزول فرما ہوئے۔ اتنے میں نادر شاہ بھی پہنچ گیا، وزیر خارجہ باہر چلے گئے۔ دونوں بادشاہوں میں دیر تک خلوت رہی۔ اس صحبت میں آپ نے نادر شاہ کو ''کلاہ و دستار لنگی، تسبیح، قرآن شریف (قلمی)، بردیمانی اور مصلیٰ بطور تحفہ حسبِ عادتِ شریفہ عطا فرمایا اور دعائے خیر سے نوازا۔

نادر شاہ نے بھی آپ کی خدمت میں کابل کے نوادرات بطور تحفہ پیش کیے، لیکن آپ نے قبول کرنے سے یہ کہہ کر انکار کر دیا کہ میں آلِ رسولؐ ہوں۔ میرا کام لینا نہیں دینا ہے۔ اس پر نادر شاہ نے لجاجت اور اصرار کر کے بطور یادگار چند کابلی تحائف جن میں سنگِ مرمر کا منقش چائے کا سیٹ، ایک لعلِ بدخشاں کی انگشتری اور پتھر کی بنی ہوئی چند اشیاء آپ کی خدمت میں پیش کیں۔ آپ نے نادر شاہ کی دلجوئی کے لئے یہ تحائف قبول فرمائے۔ انگشتری تو اسی وقت وزیر خارجہ کو انعام میں مرحمت فرمادی۔ اس پر نادر شاہ نے عرض کیا کہ حضور! ''یہ تو میں نے آپ کی خدمت میں بطور یادگار پیش کی تھی۔'' آپ نے فی البدیہہ جواب دیا کہ ''میں نے بھی اس کو یادگار کے طور پر دی ہے۔'' واپس تشریف لا کر باقی تحائف حضور نظام میر عثمان علی خاں والئی حیدرآباد دکن کو ارسال کر دیئے کہ بادشاہوں کی چیزیں بادشاہوں کے پاس ہی ہونی چاہئیں۔

☆

کابل میں لوگ عام طور پر جوتے پہن کر مسجد میں جایا کرتے تھے۔ جب آپ مسجد میں تشریف لے گئے تو نادر شاہ بھی ساتھ موجود تھا۔ مسجد کی یہ بے حرمتی دیکھ کر آپ کو سخت رنج ہوا اور برداشت نہ کر سکے۔ چنانچہ آپ نے نادر شاہ کو احترام مسجد کے احکام سنا کر متنبہ کیا۔ جس کے متعلق خود فرماتے ہیں کہ:

''میں کابل گیا۔ پٹھان جوتوں سمیت مسجد میں آ گئے۔ میں نے نادر شاہ کو ڈانٹا۔ اس پر لرزہ پڑ گیا۔ کہنے لگا، پٹھان نماز چھوڑ دیں گے۔ میں نے کہا حیدر آباد دکن میں ایک مولوی صاحب نے وعظ کیا۔ فرمایا! پٹھان ماں کے پیٹ میں بھی نماز پڑھتے ہیں۔ لوگ حیران ہو گئے۔ مولوی صاحب نے کہا، بچہ ماں کے پیٹ میں سجدہ کی حالت میں ہوتا ہے اور دو زانو ہوتا ہے۔ جب ماں سجدہ کرتی ہے تو بچے کا سجدہ بھی ہو جاتا ہے۔ میں نے نادر شاہ سے کہا کہ کیا وہ باہر آ کر نماز چھوڑ دیں گے۔''

☆

ستمبر ۱۹۳۳ء میں جنرل نادر شاہ نے ''تعلیمی اصلاح و ترقی'' کے بارے میں مشورے کے لئے حکیم الامت علامہ اقبالؒ کو افغانستان کے دورہ کی دعوت دی۔ یہ سال گزشتہ یعنی ۱۹۳۲ء کے حضرت امیر ملت رحمۃ اللہ علیہ کے دورۂ کابل کا فیضان تھا۔ اقبال کے ساتھ سر راس مسعود اور سید سلیمان ندوی بھی گئے۔ اقبال ۲۳۔ اکتوبر ۱۹۳۳ء کو کابل پہنچے۔ مہمانوں کے لئے سفر کی راحت و آرام کا ہر منزل پر بدرجہ غایت اہتمام و انتظام تھا اور نمائندگانِ حکومت مدارت کے لیے موجود تھے۔ ۴ نومبر ۱۹۳۳ء رات کو حکیم الامتؒ واپس لاہور پہنچ گئے۔ بادشاہ نے ایک سونے کی گھڑی جاوید اقبال کے لئے تحفۃً مرحمت فرمائی۔

☆

''بالِ جبریل'' صفحہ ۲۰۵ پر اقبالؒ نے ''نادر شاہ افغان'' کے زیرِ عنوان، نادر شاہ کو جو خراجِ تحسین پیش کیا ہے، قابلِ غور ہے ؎

حضورِ حق سے چلا لے کے لولوئے لالا
وہ ابر جس سے رگِ گل ہے مثلِ تارِ نفس!
بہشت راہ میں دیکھا تو ہوگیا بیتاب
عجب مقام ہے جی چاہتا ہے جاؤں برس
صدا بہشت سے آئی کہ منتظر ہے ترا
ہرات و کابل و غزنی کا سبزۂ نورس!

....

سرشکِ دیدۂ نادر بہ داغِ لالہ فشاں
چناں کہ آتشِ اُو را دگر فرونہ نشاں!

☆

''مثنوی مسافر'' کے آغاز میں جو ہدیہ تبریک پیش کیا، چند اشعار ملاحظہ ہوں ؎

نادرِ افغاں شہ درویش خُو — رحمتِ حق بر روانِ پاکِ او
کارِ ملّت محکم از تدبیرِ او — حافظِ دینِ مبیں شمشیرِ او
چوں ابوذرؓ خود گداز اندر نماز — ضربتش ہنگامِ کیں خارا گداز!
عہدِ صدیقؓ از جمالش تازہ شد! — عہدِ فاروقؓ از جلالش تازہ شد!
از غمِ دیں دردلش چوں لالہ داغ — در شبِ خاور وجودِ او چراغ!
درنگاہش مستیٔ اربابِ ذوق — جوہرِ جانش سراپا جذب و شوق
خسروی شمشیر و درویشی نگہ — ہر دو گوہر از محیطِ لا الٰہ!
فقر و شاہی وارداتِ مصطفیٰؐ است! — ایں تجلیہائے ذاتِ مصطفیٰؐ ست!

☆

آگے چل کر ''مثنوی مسافر'' میں زیرِ عنوان ''مسافر وارد می شود بہ شہرِ کابل و حاضری شود بحضورِ اعلیٰ حضرت شہید'' جنرل نادر شاہ کو جو خراج تحسین پیش کیا ہے، ملاحظہ ہو۔

شہرِ کابل! خطۂ جنّت نظیر — آبِ حیواں از رگِ تاکش بگیر!
چشمِ صائب از سوادش سرمہ چیں، — روشن و پائندہ باد آں سرزمیں
در ظلامِ شب سمن زارش نگر — بر بساطِ سبزہ می غلطد سحر!
آں دیارِ خوش سواد آں پاک بوم — بادِ او خوشتر ز بادِ شام و روم
آبِ او برّاق و خاکش تابناک — زندہ از موجِ نسیمش مُردہ خاک
ناید اندر حرف و صوت اسرارِ اُو — آفتاباں خفتہ در کہسارِ اُو
ساکنانش سیر چشم و خوش گہر — مثلِ تیغ از جوہرِ خود بے خبر!
قصرِ سلطانی کہ نامش دلکشاست — زائراں را گردِ راہش کیمیاست
شاہ را دیدم دراں کاخِ بلند — پیشِ سلطانے فقیرے دردمند!
خلقِ اُو اقلیمِ دلہارا کشود — رسم و آئینِ ملوک آنجا نہ بود
من حضورِ آں شہِ والا گہر — بے نوا مردے بدربارِ عمرؓ
جانم از سوزِ کلامش در گداز — دستِ او بوسیدم از راہِ نیاز
پادشاہے خوش کلام و سادہ پوش — سخت کوش و نرم خوئے و گرم جوش
صدق و اخلاص از نگاہش آشکار — دین و دولت از وجودش استوار
خاکی و از نوریاں پاکیزہ تر — از مقامِ فقر و شاہی باخبر
در نگاہش روزگارِ شرق و غرب — حکمتِ او راز دارِ شرق و غرب
شہر یارے چوں حکیماں نکتہ داں — راز دانِ مدّ و جزرِ امتاں
پردہ ہا از طلعتِ معنی کشود — نکتہ ہائے ملک و دیں را وانمود
گفت ازاں آتش کہ داری در بدن — من ترا دانم عزیزِ خویشتن
ہر کہ اورا از محبت رنگ و بوست — در نگاہم ہاشم و محمود اوست

در حضورِ آں مسلمانِ کریم ہدیہ آوردم ز قرآنِ عظیم
گفتم ایں سرمایۂ اہلِ حق است در ضمیر او حیاتِ مطلق است
اندرُو ہر ابتدارا انتہا است حیدرؓ از نیروئے او خیبر کشااست
نشۂ حرفم بخونِ او دوید دانہ دانہ اشک از چشمش چکید
گفت ''نادر در جہاں بے چارہ بود از غمِ دین و وطن آوارہ بود
کوہ و دشت از اضطرابم بیخبر از غمانِ بے حسابم بیخبر
نالہ با بانگِ ہزار آمیختم اشک با جوئے بہار آمیختم

غیرِ قرآں غمگسارِ من نہ بود
قوتش ہر باب رابرمن کشود''

گفتگوئے خسروِ والا نژاد باز بامن جذبۂ سرشار داد
وقتِ عصر آمد صدائے الصلوٰات آں کہ مومن راکند پاک از جہات
انتہائے عاشقاں سوز و گداز کردم اندر اقتدائے اُو نماز

رازہائے آں قیام و آں سجود
جز بزمِ محرماں نتواں کشود!

☆

ماخذ

(۱) ''سیرتِ امیر ملت'' از سیّد اختر حسین علی پوری مطبوعہ علی پور سیّداں ضلع سیال کوٹ ۱۹۷۵ء صفحہ ۲۴۲ تا ۲۴۴۔

(۲) ''پنج گنج علی پوری'' از مولانا محمد اویس خاں غوری مطبوعہ لیہ طبع دوم صفحہ ۶۷۔

(۳) ''بالِ جبریل'' از علامہ محمد اقبال مطبوعہ لاہور طبع ہفتم ستمبر ۱۹۴۷ء صفحہ ۲۰۵۔

(۴) ''مثنوی پس چہ باید کرد مع مسافر'' از علامہ اقبال مطبوعہ لاہور طبع ہفتم ۱۹۷۲ء صفحہ ۱۲،۳ تا ۱۵۔

(۵) ''حضرت مجدد الف ثانی'' اور ڈاکٹر محمد اقبال'' از پروفیسر ڈاکٹر محمد مسعود احمد مطبوعہ سیال کوٹ ۱۹۸۰ء صفحہ ۲۱۔

(۶) ''خدوخالِ اقبال'' از محمد امین زبیری مطبوعہ کراچی ۱۹۸۶ء صفحہ ۷۰۔

(۷) ''مئے لالہ فام'' از ڈاکٹر جاوید اقبال مطبوعہ لاہور ۱۹۹۶ء صفحہ ۳۳۱۔

(۸) ''زندہ رود'' از ڈاکٹر جاوید اقبال مطبوعہ لاہور ۲۰۰۴ء صفحہ ۵۷۶ تا ۵۸۶۔

(۹) ''تذکرہ شہ جماعت'' از سید حیدر حسین علی پوری مطبوعہ لاہور ۱۹۷۳ء صفحہ ۱۶۴ تا ۱۶۷۔

(۱۰) ''انوارِ شاہ جماعت'' جلد سوم (قلمی) از مرزا ذوالفقار علی بیگ فیاضؔ جماعتی آف حیدرآباد دکن (بھارت) مملوکہ محمد صادق قصوری صفحہ ۱۳۳، ۴۷۰۔

(۱۱) ''انوارِ شاہ جماعت'' جلد چہارم (قلمی) مملوکہ قصوری صفحہ ۳۵۷۔

(۱۲) ''سیرِ افغانستان'' از سید سلیمان ندوی مطبوعہ کراچی ۱۹۸۷ء متعدد صفحات۔

راقبؔ قصوریؒ

منشی امام الدین راقبؔ قصوری ابنِ شیخ عمر بخش کی ولادت بلھے شاہؒ کی نگری قصور میں ۱۸۸۴ء میں ہوئی۔ بچپن ہی سے شاعری کا شوق دامنگیر تھا چنانچہ اردو شاعری اور زبان سیکھنے کے لئے دہلی اور آگرہ کا سفر اختیار کیا۔ ۱۸۹۴ء میں بارہ سال کی عمر میں اردو شاعری کا آغاز کیا۔ پہلے نسیمؔ بھرت پوری اور پھر استاد داغؔ دہلوی کی شاگردی اختیار کی۔ جب تک قصور میں رہائش پذیر رہے، بابا بلھے شاہؒ کے مزار اقدس حاضر رہ کر ذکر وفکر میں مشغول رہتے۔

۱۹۰۵ء میں قندیل نورانی امام ربانی حضرت مجدد الف ثانیؒ کے آستانہ پر حاضر ہوئے تو مراقبے کی حالت میں پنجابی زبان میں نعت کہنے کا اشارہ ہوا۔ چنانچہ ایک پنجابی نعت لکھی ؎

یا محمدؐ یا محمدؐ آ کدی کر پھیریاں
تیری بندی چنگی مندی در تیرے دی چیریاں

جو بہت پسند کی گئی۔ اس پر انہوں نے اردو شاعری کی نسبت پنجابی شاعری پر زیادہ توجہ دینا شروع کر دی اور نئی نئی بحروں، راگوں اور سروں میں نعتیں لکھنے کی طرح ڈالی۔ پنجابی کی کئی بحریں از خود ایجاد کیں۔ جب قوالوں نے ان کی نعتیں سُر تال سے بولنا شروع کیں تو سننے والوں پر وجد طاری ہو جاتا۔

☆

راقبؔ قصوری نے حضرت امیر ملت پیر سید جماعت علی شاہ محدث علی پوریؒ کے دستِ حق پر بیعت کی تھی اور اپنے شیخ سے عنایت درجہ عقیدت و محبت رکھتے تھے جس کا اظہار انہوں

نے اپنے کلام میں جابجا کیا ہے۔ حضرت امیر ملت قدس سرہ العزیز ''انجمن خدام الصوفیہ ہند'' علی پور سیداں ضلع سیالکوٹ کے سالانہ اجلاسوں میں علماء کرام، نعت خوانانِ عظام کو مختلف قسم کے انعامات اور تمغے عطا فرما کر ان کی حوصلہ افزائی فرمایا کرتے تھے تا کہ وہ لگن، شوق اور دلجمعی سے دینِ حقہ کی خدمت کا فریضہ انجام دیں۔ حضرت راقبؔ کو بھی کئی بار یہ اعزازات ملے۔

☆

راقبؔ قصوری کے مندرجہ ذیل نعتیہ مجموعے ہمارے علم میں آسکے (۱) ''تحفۂ راقب حصہ اول الموسوم خلعتِ نوری'' (اردو نعتیہ کلام) (۲) ''رسولؐ اللہ دی مہجوری'' (پنجابی نعتیہ کلام) (۳) ''روضے مبارک دی چوری'' (پنجابی نعتیہ کلام) (۴) ''مولا دی منظوری'' (پنجابی نعتیہ کلام) (۵) ''مدینے پاک دی کستوری'' (پنجابی نعتیہ کلام) (۶) ''نبی کریمؐ دی دوری'' (پنجابی نعتیہ کلام) (۷) ''حضرت دی حضوری'' (پنجابی نعتیہ کلام)۔ ان سب کو ترتیب دے کر راقم آثم محمد صادق قصوری نے ''کلیاتِ راقبؔ قصوری کے نام سے ۱۹۹۶ء میں چھپوادیا ہے۔

راقبؔ کی نعت میں ہجر و فراق کے اتنے رنگ نظر آتے ہیں کہ ان کی وسعتِ نظر کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ ہجر و فراق کے کچھ رنگ تو حکیم الامت علامہ اقبالؒ سے ملتے ہیں۔ راقبؔ اور اقبالؔ دونوں حضور اقدس صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت میں فناہ تھے اور ان کے طائرانِ خیال ہمیشہ رسول پاک علیہ التحیہ والثنا کے روضۂ پاک کے اردگرد پرواز کرتے رہے مگر دونوں کو ظاہری حاضری نصیب نہ ہوئی۔ دونوں کی حالت ''درراہِ عشق فاصلۂ قرب و بعد نیست'' (حافظ شیرازیؒ) والی تھی۔ علامہ اقبالؒ نے آخری عمر میں حجاز مقدس کی طرف جو خیالی سفر کیا، اس کا تذکرہ وہ یوں کرتے ہیں ؎

با ایں پیری رہِ یثرب گرفتم	نواخواں از سرورِ عاشقانہ
چوں آں مرغے کہ در صحرا سرِ شام	کشاید پر بہ فکرِ آشیانہ

راقبؔ قصوری اس کیفیت کا بیان اس طرح کرتے ہیں ؎

خبرے ہن میں بڈھڑے ویلے ٹُرپواں ماہی دے دیس

شام نوں کڑیاں جویں اُٹھ بھجدیاں گھر بار نوں

یہاں یہ بات ملحوظ خاطر رکھنی چاہئے کہ پنجابی روایت میں ''کڑیاں'' کو ''چڑیاں'' کہا جاتا ہے۔

راقبؔ قصوری کی رحلت ۱۹ جون ۱۹۳۶ء بروز جمعۃ المبارک فیروز پور شہر (حال بھارت) میں ہوئی اور وہیں آخری آرام گاہ بنی۔

☆

..............................ماخذ..............................

(۱) ''تذکرہ شعرائے جماعتیہ'' از محمد صادق قصوری مطبوعہ ۲۰۰۶ء صفحہ ۳۳ تا ۴۰۔

(۲) ''پنجابی شاعراں دا تذکرہ'' از مولا بخش کشتہ امرتسری مطبوعہ لاہور ۱۹۶۰ء۔

(۳) ''جامع اردو انسائیکلوپیڈیا'' جلد اوّل مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز، لاہور ۱۹۸۷ء صفحہ ۶۵۰۔

ڈاکٹر سیّد ظفر الحسن انبالویؒ

ڈاکٹر سیّد ظفر الحسن بن سیّد دیوان محمد کی ولادت ۱۴ فروری ۱۸۷۹ء کو سیال کوٹ میں ہوئی۔ آبائی وطن قصبہ کھرڑ ضلع انبالہ (مشرقی پنجاب، بھارت) تھا۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے ایم اے (فلسفہ) کرنے کے بعد جرمنی سے فلسفہ کے مضمون REALISM پر ''پی ایچ ڈی'' کی اور واپس آتے ہی علی گڑھ میں فلسفہ کے استاد ہوگئے اور پھر ترقی کرتے کرتے صدر شعبۂ فلسفہ کے عہدۂ جلیلہ تک جا پہنچے۔ آپ پہلے ہندوستانی تھے جنہوں نے ''فلسفہ'' کے مضمون REALISM پر پی ایچ ڈی کی ڈگری حاصل کی۔

☆

ڈاکٹر صاحب کی شادی قائد اعظم کے عظیم ساتھی اور برصغیر کے نامور ادیب، شاعر اور صوفی بزرگ میر سیّد غلام بھیک نیرنگ انبالویؒ کی صاحبزادی سے ہوئی تھی۔ آپ علوم عربیہ اسلامیہ اور غربیہ والکلزیہ کے امام عصر تھے۔ حق یہ ہے کہ علومِ اسلامیہ حاضرہ کے اندر حکیم الامت علامہ محمد اقبالؒ کے بعد ان کے پایہ کا کوئی دوسرا محقق، حکیم و عارف اس زمانہ میں یورپ و ایشیاء میں نہیں تھا۔

☆

ڈاکٹر صاحب نہ صرف حکیم و فیلسوف اعظم تھے بلکہ زبردست صاحبِ طریقت، صاحبِ ذوق و بصیرت، صاحبِ باطن و جمال اور پکے مسلمان تھے۔ صورتاً و سیرتاً مسلمان تھے۔ چہرہ مبارک پر شاندار لمبی داڑھی رکھتے تھے۔ نماز اور وظائف کے پابند تھے۔ قندیل نورانی حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ کے خصوصی طور پر معتقد تھے۔ ان کی

بیعت قبلۂ عالم امیر ملّت حضرت پیر سیّد جماعت علی شاہ محدث علی پوری رحمۃ اللہ علیہ سے تھی۔فنا فی الشیخ کے مقام پر فائز تھے۔اپنی تقریروں اور نجی گفتگوؤں میں اکثر و بیشتر اپنے پیرو مرشد کا ذکر فرماتے رہتے تھے۔علی پور شریف حاضر ہو کر روحانی استفادہ کرتے رہتے تھے۔

ڈاکٹر صاحب کی بیعت کے بارے میں جناب عبدالروف عروج اپنی کتاب ''رجال اقبال''، مطبوعہ نفیس اکیڈمی کراچی مارچ ۱۹۸۸ء صفحہ ۳۲۳ پر لکھتے ہیں کہ:

''ڈاکٹر صاحب علی گڑھ میں اسلامی اور ملی تحریکوں کے روح رواں بھی سمجھے جاتے تھے۔ جب اقبال نے خطبۂ الہ آباد پڑھا اور اس میں ایک جداگانہ مسلم ریاست کے قیام کے مسئلہ پر لوگوں کی توجہ مبذول کروائی تو ڈاکٹر صاحب نے اقبال کے نقطۂ نظر کو علی گڑھ میں عام کیا۔''پاکستان علی گڑھ اسکیم'' مرتب کی اور اس کو عام کرنے کے لئے اپنے ہزاروں شاگردوں سے کام لیا۔ ان کے نامور شاگردوں میں ڈاکٹر برہان احمد فاروقی اور ڈاکٹر افضال حسین قادری کئی مرتبہ علی گڑھ سے لاہور پہنچے اور اس موضوع پر اقبال سے رہنمائی لی۔

ڈاکٹر سیّد ظفر الحسن اس سکیم کو جلد سے جلد شائع کر کے عام کر دینا چاہتے تھے، لیکن تمام کوششوں کے باوجود وہ اس اسکیم کو اقبال کی زندگی میں مرتب و مدون نہیں کر سکے۔ یہ اسکیم اقبال کی وفات کے اگلے سال ۱۹۳۹ء میں مرتب ہوئی۔ انہوں نے اس اسکیم کو مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے اجلاس میں پیش کیا۔ اس کے بعد تحریک پاکستان کو علی گڑھ کی جانب سے زبردست تقویت ملی،اسی زمانے میں ڈاکٹر صاحب کا میلان مذہب و تصوف کی طرف زیادہ ہو گیا تھا۔ وہ ایک مسلمان اور فلسفی کی حیثیت سے تصوف سے زیادہ دلچسپی

لیتے تھے۔ اور انہوں نے جب یہ دیکھا کہ علی پور (سیّداں) کے مشہور بزرگ سیّد جماعت علی شاہ بھی تحریک پاکستان میں شامل ہوگئے ہیں، اور مسلم لیگ کی توسیع اور اثر ونفوذ کے لئے کام کررہے ہیں، انہوں نے ان کے ہاتھوں پر بیعت کرلی۔ اور ان کے زمرۂ مریدوں میں شامل ہوگئے۔''

☆

ڈاکٹر صاحب کا بہت بڑا کارنامہ ہندی کفر اور ہندو اتحاد کی تفسیر جدید یعنی گاندھیت کی تحلیل ہے۔ ہندی کفر یعنی گاندھیت جب کانگرس پارٹی کے مذہب مسلطہ اور دین قاہرہ کی صورت میں ظاہر ہوئی اور ''واردھا تعلیمی اسکیم'' کے ذریعے اس نے مسلمانوں کو مرتد کرنے کی ترکیب نکالی تو مردحکیم، مرد مسلم ومجاہد بن کر ظاہر ہوا۔ بابائے قوم حضرت قائداعظمؒ نے آل انڈیا مسلم لیگ کے ماتحت ایک ''مسلم تعلیمی کمیٹی'' قائم کی جس کے صدر ڈاکٹر سیّد ظفر الحسن تھے اور سیکرٹری ان کے شاگرد رشید ڈاکٹر افضال حسین قادری تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی بلند پایہ رپورٹ ''واردھا سکیم'' کے لئے پروانۂ موت ثابت ہوئی۔ بعدازاں ''آل انڈیا مسلم ایجوکیشنل کانفرنس'' نے ''مسلم تعلیمی اسکیم'' ڈاکٹر صاحب کی نگرانی میں تیار کی۔ ڈاکٹر صاحب کی رپورٹ اور اسکیموں کو آج پاکستان میں بروئے کار لانے کی اشد ضرورت ہے۔

☆

ڈاکٹر صاحب کا سب سے بڑا کارنامہ، ''علی گڑھ پاکستان اسکیم'' کو ستمبر ۱۹۳۹ء میں کتابی، علمی وعملی شکل میں پیش کرنا تھا۔ پاکستان کی آواز تو بلند ہورہی تھی لیکن اس کی کوئی علمی و عملی صورت اور اس کی فلسفیانہ اور منطقی بنیاد کو واضح اور معین شکل میں اب تک پیش نہ کرسکا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے اپنے پیرومرشد حضرت امیر ملّت پیر سیّد جماعت علی شاہ قدس سرہ العزیز کے ارشاد پر اپنے شاگرد خاص ڈاکٹر افضال حسین قادری کے تعاون سے یہ سکیم مع چارٹ ونقشہ جات اور مقدمہ بعنوان ''ہندوستان کے مسلمانوں کا مسئلہ اور اس کا حل''

مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے سامنے پیش کی جس نے ''علی گڑھ پاکستان اسکیم'' کے نام سے شہرتِ عام بقائے دوام حاصل کی۔ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے تمام اساتذہ اکرام اور پروفیسران کا زبردست بیان سکیم کی تائید وحمایت میں شائع ہوا اور جلد ہی یہ سکیم پورے برصغیر میں ہر دل کی دھڑکن بن گئی۔

اس اسکیم کی تیاری میں حضرت امیر ملت قدس سرہ العزیز کے مشورہ پر ڈاکٹر صاحبؒ اور حکیم الامت علامہ محمد اقبالؒ کے مابین کچھ عرصہ خط و کتابت بھی رہی۔ اور بعض باتوں کی وضاحت کے لئے ڈاکٹر صاحبؒ نے اپنے شاگرد خاص ڈاکٹر برہان احمد فاروقیؒ کو بارہا حضرت حکیم الامتؒ کی خدمت میں بھیجا۔ ڈاکٹر صاحبؒ کا خیال تھا کہ ہندوستان کے مسلمانوں کی اپنی ایک علیحدہ قومی شناخت ہے جو بڑی حد تک غیر مسلموں سے مختلف ہے۔ اس اسکیم میں ہندوستان کو تین خود مختار وفاقوں میں تقسیم کرنے کا مشورہ دیا گیا تھا جن میں سے ایک شمال مغرب میں واقع چار مسلم اکثریتی صوبوں اور متعدد چھوٹی ریاستوں پر، دوسرا بنگال (ہاوڑہ، مدنا پور، بہار کا ضلع پورینا اور آسام کا ضلع سہلٹ نکال کر) پر اور تیسرا باقی ماندہ ہندوستان (چند علاقے مستثنیٰ کرکے) پر مشتمل ہو جس کے لئے انہوں نے خصوصی حیثیت کی ٹھوس تجویز پیش کی۔ ڈاکٹر صاحبؒ نے یہ بھی تجویز پیش کی کہ ان تینوں وفاقوں کو دفاع اور حملہ کے لئے باہمی اتحاد کی اجازت دی جائے۔

☆

پروفیسر جعفر بلوچ اپنی کتاب ''مجالس اقبال'' مطبوعہ لاہور ۲۰۰۲ء میں لکھتے ہیں کہ:

> ''بیسویں صدی کے ربع اول میں اسلامیانِ ہند نے بڑی بڑی تحریکیں چلائیں، جن کا تعلق براہِ راست برطانوی استعمار کے خلاف جدوجہد کرنے سے تھا۔ تحریکِ خلافت کے بعد مسلمانانِ ہند پر یاس وقنوطیت کا عالم چھا گیا تھا۔ اس کے باوجود مختلف مقامات کے حساس مسلمانوں میں اعلائے کلمۃ الحق کے لئے جذبۂ

عمل بیدار ہوا۔ ۱۹۳۵ء کے لگ بھگ مختلف طبقوں کے مسلمانوں میں احیائے اسلام کے لئے سوچ بچار شروع ہوگئی......

مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں ڈاکٹر سیّد ظفر الحسن صدر شعبہ فلسفہ جیسے لوگ اس موضوع پر غور وفکر کر رہے تھے۔ سب لوگوں کی نظر رہنمائی کے لئے علامہ اقبالؒ پر تھی۔

ڈاکٹر سیّد ظفر الحسن نے اس سلسلہ میں حکیم الامتؒ کو اپنی سکیم کا مسودہ ارسال کیا۔ علامہ اقبالؒ نے ''شبان المسلمین'' سکیم کا نام تجویز کیا۔ علی گڑھ سے ڈاکٹر برہان احمد فاروقی، محمد محمود احمد لیکچرر فلسفہ کو اقبال سے بات چیت کرنے کے لئے علامہ کی خدمت میں بھیجا۔ ستمبر ۳۵ء کے شروع میں فارم رکنیت چھپوائے گئے اور کام شروع کر دیا گیا۔ علامہ اقبالؒ ''امیر چنے گئے۔'' (صفحہ ۱۵۶ تا ۱۶۲،۱۸۴)

☆

ڈاکٹر سیّد ظفر الحسن کے علامہ اقبالؒ سے تعلقات کے بارے میں فرزندِ اقبال جناب ڈاکٹر جاوید اقبال اپنی کتاب ''زندہ رود'' مطبوعہ لاہور ۲۰۰۴ء میں رقمطراز ہیں:

''علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبہ فلسفہ نے وائس چانسلر سر راس مسعود کے ذریعے درخواست کی کہ علی گڑھ میں اقبالؒ اپنے مقالات پڑھ کر اعزاز بخشیں۔ چنانچہ ۱۷ نومبر ۱۹۲۹ء کو اقبال، عبداللہ چغتائی کے ساتھ علی گڑھ روانہ ہوئے۔ جب علی گڑھ پہنچے تو سر راس مسعود کسی کام کے لئے بھوپال گئے ہوئے تھے۔ ریلوے سٹیشن پر اساتذہ اور طلباء نے شاندار استقبال کیا۔ اور وہ صدر شعبہ فلسفہ ڈاکٹر سیّد ظفر الحسن کے ہاں جا کر مقیم ہوگئے۔ اگلے روز

سرراس مسعود بھی بھوپال سے واپس آ گئے۔ علی گڑھ میں اقبالؔ کا قیام ۳۰ نومبر ۱۹۲۹ء تک رہا۔ اس دوران انہوں نے چھ مقالات اسٹریچی ہال میں پڑھے۔ پہلے جلسے میں سرراس مسعود نے اقبالؔ کا تعارف انتہائی ذاتی عقیدت کے جذبات کے ساتھ کرایا۔
علی گڑھ میں اقبالؔ کا بیشتر وقت علمی مجلسوں یا علمی صحبتوں میں گزرا۔ سرراس مسعود، ڈاکٹر سیّد ظفر الحسن، خواجہ غلام السیدین، ڈاکٹر سرضیاء الدین احمد، بشیر حسین زیدی اور ڈاکٹر عطاء اللہ بٹ نے ان کے اعزاز میں دعوتیں دیں۔ (صفحہ ۴۳۳، ۴۳۴)۔

☆

ڈاکٹر صاحب کا ایک اور بہت بڑا کارنامہ حضرت قائداعظمؒ کو، جواب تک ''پاکستان سکیم'' کے قائل نہیں تھے، انہیں فکر اقبالؔ کی روشنی میں تیار کردہ اس سکیم کی بنیاد پر مسلسل مذاکرات و مباحثات و مکالمات کے ذریعہ قائل کرنا تھا۔ یہ اسی کا نتیجہ تھا کہ قائداعظمؒ نے مارچ ۱۹۴۰ء میں اجلاس لاہور آل انڈیا مسلم لیگ میں ''قرارداد پاکستان'' پیش کی۔ یہ غالباً لوگوں کو معلوم نہیں کہ حضرت قائداعظمؒ کے خطبہ لاہور کا وہ تمام حصہ جو ٹو نیشن تھیوری'' پر مشتمل ہے وہ سب ڈاکٹر صاحبؒ کا لکھا ہوا ہے۔ قرارداد لاہور، اس کی منطقی فلسفیانہ تھیوری پر قائداعظمؒ کا خطبہ لاہور اس عارفِ علی گڑھ کا فیضانِ روحانی تھا اور ایسا ہونا ہی تھا کیونکہ ساری تحریک پاکستان، تحریک علی گڑھ کا ثمرہ ہے۔
ڈاکٹر سیّد ظفر الحسن کی رحلت ۱۹ جون ۱۹۴۹ء مطابق ۲۲ شعبان المعظم ۱۳۶۸ھ بروز پیر راولپنڈی میں ہوئی، جسدِ مبارک کو لاہور لا کر قبرستان میانی صاحب میر غلام بھیک نیرنگ کی قبر سے متصل جانبِ شرق سپرد خاک کر دیا گیا۔ حضرت طارق سلطانپوری نے قطعہ تاریخ رحلت کہا جو ڈاکٹر صاحب کی حیات و خدمات، تعلیمات، فہم و فراست، دانش و حکمت اور وسعت فکر و نظر کا بہترین عکاس ہے۔

آپ، قائداعظمؒ کو ساتھ لے کر حضرت امیر ملت رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت اقدس نے قائداعظمؒ کی شاہانہ دعوت کی اور پھر مسلم لیگ اور قائداعظمؒ کی کامیابی کے لئے دعا فرمائی۔ دعوت کے بعد شام کو قائداعظمؒ نے خاموشی کے ساتھ حضرت امیر ملت علیہ الرحمہ کے دستِ حق پرست پر بیعت کی سعادت بھی حاصل کر لی۔ یہی وجہ ہے کہ قائداعظم مکمل طور پر شریعت کے پابند ہو گئے تھے۔ اب آہِ سحر گاہی اور دعائے نیم شبی ان کا وظیفہ بن چکا تھا۔

☆

۲۷۔ جولائی ۱۹۴۶ء کو ''مسلم کانفرنس'' کے ایک خصوصی کنونشن میں (جس کی صدارت آپ نے کی) ''قراردادِ آزادیٔ کشمیر'' پاس کرتے ہوئے ریاست کے مسلمانوں کو اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا آزادانہ حق دینے کا مطالبہ کیا اور ساتھ ہی واضح کیا کہ اگر یہ مطالبہ تسلیم نہ ہوا تو ''مسلم کانفرنس'' پوری قوت سے آزادیٔ کشمیر کے لئے جدوجہد کرے گی۔ قرارداد کے منظور ہوتے ہی ڈوگرہ ایوان میں لرزہ طاری ہو گیا اور آپ کو گرفتار کر لیا گیا۔

آپ کے حکم کے مطابق ریاستی عوام نے پاکستان کے لئے بیش بہا قربانیاں دیں اور شیخ عبداللہ کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد نومبر ۱۹۴۷ء میں جموں میں لاکھوں مسلمانوں نے جامِ شہادت نوش کیا۔ قیامِ پاکستان کے وقت اگرچہ آپ جیل میں تھے مگر آپ کے دیوانوں اور پروانوں نے آپ کی اسیری اور قید و بند کے دوران ہی ''آزاد کشمیر'' کا علاقہ ڈوگرہ غلامی سے آزاد کرا لیا۔ ۱۹۴۸ء میں آپ قیدیوں کے تبادلہ میں پاکستان آ گئے تو قائداعظمؒ نے آپ کو آزاد کشمیر کا سپریم ہیڈ بنا دیا۔ آپ نے ہزاروں مہاجرین کے قافلوں کی دیکھ بھال اور آزاد کشمیر حکومت کی تشکیل کے لئے بے پناہ کام کیا۔

☆

قائداعظمؒ کی رحلت کے بعد حکمرانوں نے آپ کی خدمات کو یکسر فراموش کر کے آپ سے منہ موڑ لیا اور ہر لحاظ سے آپ کی حوصلہ شکنی کی گئی۔ اربابِ اقتدار و اختیار اور وزارت

امورِ کشمیر نے آپ سے جو ناروا رویہ اپنایا اور ذہنی اور فکری پریشانیاں دیں، اس سے انہیں کینسر کا نامراد اور موذی مرض لاحق ہو گیا مگر انتہائی نامساعد حالات کے باوجود کبھی بھی کسی حاکم کے سامنے سرنگوں نہیں کیا۔

قوموں کی تقدیر و مردِ درویش
جس نے نہ ڈھونڈی سلطاں کی درگاہ

اس درویش منش عظیم رہنما نے پاکستان میں کوئی جائیداد بنانے کی بجائے ریاست جموں و کشمیر کا مستقبل پاکستان سے وابستہ کرنے کے لئے اپنی جوانی کو بڑھاپے میں تبدیل کیا۔ گوناگوں مصائب و آلام کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ انتہائی نامساعد حالات کا سامنا کرنے کے باوجود کشمیری مسلمانوں اور بالخصوص مسلم کانفرنس کے کارکنوں کو ہمیشہ یہی درس دیا کہ:

''غلام عباس پہلے پاکستانی ہے اور پھر کشمیری۔''

اے کاش! پاکستان کے اربابِ اقتدار و بست و کشاد قائد ملت رحمۃ اللہ علیہ کے مقام، مرتبہ، فکر اور مشن کو سمجھنے کی سعی و کوشش کرتے۔

☆

چودھری صاحب کو شروع سے ہی حضرت علامہ اقبالؒ سے خصوصی تعلق تھا۔ ۱۹۳۲ء میں انہوں نے ''آل جموں و کشمیر مسلم کانفرنس'' کے جنرل سیکرٹری کی حیثیت سے کشمیری مسلمانوں پر ڈوگرہ راج کے ہونے والے مظالم کی تفصیل بیان کرتے ہوئے اقبالؒ کی خدمت ایک طویل خط لکھا اور مالی امداد کی اپیل کی۔ ان کی اس اپیل پر حضرت اقبالؒ نے ایک خط کے ذریعے نواب بہادر یار جنگ کی توجہ اس مسئلہ کی جانب مبذول کراتے ہوئے لکھا:

''اس وقت حکومت کی طرف سے (کشمیری مسلمانوں پر) متعدد مقدمات چل رہے ہیں، جن کے اخراجات کی وجہ سے فنڈ کی نہایت ضرورت ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کی تھوڑی سی توجہ سے یہ مشکل حل ہو جائے گی۔''

چودھری صاحب کی حیاتِ طیبہ پر ایک عظیم کتاب ''قائد کشمیر'' کے مصنف بشیر احمد قریشی لکھتے ہیں کہ ''تحریکِ آزادیٔ کشمیر'' کی پہلی دہائی میں یعنی ۱۹۳۸ء تک چودھری صاحب اکثر مصور پاکستان شاعر مشرق حکیم الامت علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ سے صلاح و مشورہ اور ہدایات لینے کے لئے اکثر لاہور میں ان کی خدمت میں حاضر ہوتے رہتے۔ چند مرتبہ جناب اے آر ساغر بھی ان کے ہمراہ تھے۔ ساغر صاحب فرماتے ہیں کہ:

''حضرت علامہ کو تحریک کے سلسلہ میں چودھری صاحب پر مکمل اعتماد تھا۔ اور چودھری صاحب کی علامہ صاحب سے عقیدت کا یہ عالم تھا کہ جب بھی ملاقات کے بعد رخصت ہوتے تو پہلے ان کے ہاتھوں کو بوسہ دیتے اور پھر سلام کر کے الٹے پاؤں دروازے تک جاتے تا کہ علامہ اقبال کی طرف پیٹھ نہ ہو۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قائد ملت کو حضرت علامہ کے سیاسی اور روحانی مرتبہ کا پورا علم تھا۔'' (صفحہ ۲۹۷، ۲۹۸)

☆

آخر عمر میں آپ کینسر جیسے موذی مرض کا شکار ہو گئے۔ بغرض علاج لندن بھی گئے مگر مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ اور آخرکار اسلامیان کشمیر کا یہ عظیم اور محبوب رہنما، مرورِ ایام کی صاعقہ ریزیوں اور اپنوں کی زیادتیوں کا شکار ہو کر ۱۵۔ رمضان المبارک ۱۳۸۷ھ مطابق ۱۸۔ دسمبر ۱۹۶۷ء بروز پیر گیارہ بج کر چالیس منٹ پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے میٹھی نیند سو گیا، جس کی ساری زندگی حکیم الامتؒ کے اس شعر کی مکمل تصویر بنی رہی ۔

نگہ بلند سخن دلنواز، جاں پرسوز
یہی ہے رختِ سفر میر کارواں کے لئے

آپ کی آخری آرامگاہ ۱۹۔ دسمبر کو فیض آباد، راولپنڈی میں بنائی گئی جہاں ۶ بجے شام افطاری کے بعد سپرد خاک کر دیئے گئے۔ آپ کی وصیت کے مطابق قرآن پاک، جائے نماز

اور تسبیح ساتھ ہی دفن کردی گئی۔ ملک بھر کے اخبارات و رسائل اور مذہبی و سیاسی شخصیات نے بھرپور خراجِ تحسین پیش کیا۔ شعرائے کرام نے مرثیے اور قطعاتِ تاریخ وفات لکھے۔ جناب رئیس امروہوی نے مندرجہ ذیل ''قطعۂ تاریخ وصال'' لکھ کر تو قلم ہی توڑ دیا۔

سکّہ فتح بنامِ عباس — خطبۂ جنگ پیامِ عباس

قید کی شام تھی عباس کی صبح — عزم کی صبح تھی شامِ عباس

آہ! وہ وادیٔ کشمیر کا شیر — روضۂ خلد مقامِ عباس

زندگی عالم مرگِ مرحوم — موت ہے عمرِ دوامِ عباس

اشکِ رودادِ زعیمِ کشمیر

آہ! ''عنوانِ غلامِ عباس''

..................۱۳۸۷ھ..................

..................ماخذ..................

(۱) ''کاروانِ تحریکِ پاکستان'' از محمد صادق قصوری مطبوعہ لاہور ۲۰۰۵ء صفحہ ۱۰۹ تا ۱۱۹۔

(۲) ''قائد کشمیر'' از بشیر احمد قریشی مطبوعہ مظفر آباد (آزاد کشمیر) طبع چہارم ۱۹۹۴ء متعدد صفحات۔

(۳) ''رجالِ اقبال'' از عبدالرؤف عروج مطبوعہ کراچی ۱۹۸۸ء صفحہ ۳۸۷۔

(۴) ''سیرتِ امیر ملّت'' از سیّد اختر حسین علی پوری مطبوعہ علی پور سیّداں ضلع سیالکوٹ ۱۹۷۵ء صفحہ ۴۸۴۔

(۵) ''حضرت امیر ملّتؒ اور تحریکِ پاکستان'' از محمد صادق قصوری مطبوعہ لاہور ۱۹۹۴ء صفحہ ۴۶۔

(۶) مجلّہ ''چٹن'' گورنمنٹ ڈگری کالج بھمبر، آزاد کشمیر، ''چودھری غلام عباس نمبر'' ۱۹۹۰ء متعدد صفحات۔

(۷) ''اوراقِ پارینہ'' (کشمیر بات)، از خواجہ غلام احمد پنڈت مطبوعہ مظفر آباد (آزاد کشمیر)

سن ندارد ص ۴۲ تا ۵۱۔

(۸) ''کشمیر آزادی کی دہلیز پر'' (یادوں کے چراغ) از خواجہ غلام احمد پنڈت مطبوعہ جنگ پبلشرز لاہور ۱۹۹۱ء متعدد صفحات۔

(۹) ''اکابر تحریک پاکستان'' جلد دوم از محمد صادق قصوری مطبوعہ لاہور ۱۹۷۹ء صفحہ ۲۱۰ تا ۲۱۶۔

(۱۰) ''شہاب نامہ'' از قدرت اللہ شہاب مطبوعہ لاہور طبع یازدہم ۱۹۹۲ء متعدد صفحات۔

☆

نواب میر عثمان علی خاںؒ نظامِ حیدرآباد دکن

نواب میر عثمان علی خاں آصف جاہ ہفتم بن نواب میر محبوب علی خاں آصف جاہ سادس ۶۔اپریل ۱۸۸۶ء کو حیدرآباد دکن میں پیدا ہوئے۔مولانا انوار اللہ خان فضیلت جنگ اور عماد الملک سیّد حسین بلگرامی جیسے صاحبانِ علم و فضل سے فیضِ صحبت و تربیت حاصل ہوا۔ اور فارسی، اردو اور مشرقی اور دینی علوم کی تعلیم پائی۔ ساتھ ہی ساتھ سر افسر الملک کمانڈر افواج سے شہسواری اور فنونِ حرب کی تربیت حاصل کی۔ ۲۸۔ اگست ۱۹۱۱ء کو سریر آرائے سلطنت ہوئے۔

☆

میر عثمان علی خاں کی پہلی بیعت حضرت مولانا خیر المبین صدیقی قادریؒ آف حیدرآباد دکن سے تھی۔۱۹۲۲ء میں ان کی رحلت کے بعد امیر ملت پیر سیّد جماعت علی شاہ محدث علی پوری قدس سرہ العزیز سے شرفِ بیعت حاصل کیا۔ میر صاحب کو حضرت اقدس سے بے پناہ عقیدت و محبت تھی اور حضرت بھی خصوصی شفقت فرماتے تھے۔ میر صاحب اردو اور فارسی میں شاعری بھی کرتے تھے۔جلیلؔ مانکپوری سے شرف تلمذ تھا۔ ماہنامہ ''انوار الصوفیہ'' لاہور اور سیال کوٹ میں ان کا کلام چھپتا تھا۔ پیرومرشد کے ارشاد پر برصغیر کے متعدد مذہبی، تعلیمی اور رفاہی اداروں کے ماہانے اور سالانے مقرر کئے گئے تھے۔

☆

حکیم الامت علامہ اقبالؒ نے دو دفعہ حیدرآباد دکن کا سفر اختیار فرمایا۔ پہلی دفعہ ۱۹۱۰ء اور دوسری دفعہ ۱۹۲۹ء میں۔ حضرت علامہؒ کے فرزند گرامی ڈاکٹر جاوید اقبال لکھتے ہیں:

''۱۳۔ جنوری ۱۹۲۹ء کو صبح ساڑھے آٹھ بجے اقبالؔ بنگلور سے حیدرآباد دکن روانہ ہوئے۔ وہاں عثمانیہ یونیورسٹی میں لیکچروں کی دعوت تھی جو انہوں نے قبول کر لی تھی۔ ۱۴۔ جنوری کو جب گاڑی حیدرآباد کے سٹیشن پر رکی تو پلیٹ فارم پر سینکڑوں مسلمان بچے اقبال کا کلام خوش الحانی سے پڑھ رہے تھے۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے رجسٹرار انصاری و دیگر اصحاب یہیں سے ساتھ ہو لیئے۔ انہوں نے اقبالؔ کو مطلع کیا کہ وہ حیدرآباد میں حکومتِ نظام کے مہمان ہوں گے۔ لہٰذا انہیں سرکاری گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرنا ہوگا۔ اگلے سٹیشن سکندرآباد پر اترنا تھا، جب وہاں پہنچے تو سر اکبر حیدری، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، مولانا عبداللہ عمادی، سیّد ابراہیم، ڈاکٹر مظفر الدین قریشی اور عثمانیہ یونیورسٹی کے دیگر اساتذہ استقبال کے لئے موجود تھے۔ دستور کے مطابق اقبال کو پھولوں کے ہار پہنائے گئے۔ اس کے بعد وہ سر اکبر حیدری کے ہمراہ گیسٹ ہاؤس میں پہنچ گئے۔

۱۴۔ جنوری تا ۱۸۔ جنوری حیدرآباد میں قیام، ۱۵۔ جنوری کو پہلا لیکچر، ۱۷۔ کو دوسرا لیکچر ہوا۔ ۱۸۔ جنوری کو صبح گیارہ بجے اقبالؔ، نظام سے ملے۔ نظام کے دربار جانے والوں کے لئے لازمی ہوتا تھا کہ وہ آصف جاہی دستار اور بگلس لگائیں لیکن اقبال پر کوئی پابندی نہ تھی۔ اقبالؔ نے ملاقات کے دوران نظام کو ''انجمن حمایت اسلام'' (لاہور) کے آئندہ سالانہ جلسے کی صدارت کے لئے لاہور آنے کی دعوت دی جو نظام نے قبول کر لی۔ اس سلسلے میں بعد میں اقبالؔ کی نظام کے ساتھ خط و کتابت بھی ہوئی، لیکن بالآخر نظام اپنی بعض ناگزیر مجبوریوں کے سبب لاہور نہ آ سکے۔ ۱۹۔ جنوری کو اقبالؔ، حیدرآباد سے لاہور روانہ ہوئے۔ (''زندہ رود صفحہ ۴۳۲، ۴۳۳)

☆

''ارمغانِ دکن'' کے مصنف محمد احمد خان لکھتے ہیں:

علامہ اقبال نے حیدرآباد دکن کا پہلا سفر ۱۹۱۰ء میں کیا اور دوسری اور آخری بار جنوری ۱۹۲۹ء میں حیدرآباد دکن تشریف لے گئے۔ انہیں جامعہ عثمانیہ کی جانب سے فلسفہ پر توسیعی تقاریر کے سلسلہ میں مدعو کیا گیا تھا۔ ۱۵۔ جنوری ۱۹۲۹ء کو ٹاؤن ہال میں ان کی پہلی تقریر ہوئی، جس کی صدارت مہاراجہ کرشن پرشاد نے کی اور دوسرے لیکچرر کی صدارت دکن کے فاضل بے بدل سرامین جنگ نے فرمائی۔ لیکچر کے آغاز سے پہلے سرامین جنگ نے موقعہ کی مناسبت سے حضرت علامہ کا یہ شعر پڑھا ۔

غلامِ ہمتِ آں خود پرستم
کہ از نور خودی بیند خدارا

اس موقعہ پر حضرت علامہ کے اعزاز میں ایک مشاعرہ بھی منعقد ہوا تھا، جس میں حیدرآباد کے تمام اردو و فارسی شعراء مدعو تھے۔ مشاعرہ کے بعد جب علامہ، حضور نظام سے ملنے کے لئے گئے تو جناب خلیفہ عبدالحکیم بھی ان کے ہمراہ تھے۔ پہلے تو حسبِ قاعدہ وہ محل کی کتابِ حضوری میں اپنا نام لکھ کر واپس ہو گئے۔ جب یہ کتاب حضور نظام کے ملاحظہ میں پیش ہوئی تو حکم ہوا کہ علامہ کو بلایا جائے۔ چنانچہ ہرکارہ دوڑا اور علامہ کو فرمانِ شاہی کی خبر دی۔ علامہ واپس کنگ کوٹھی تشریف لے گئے اور حضور نظام سے ملاقات کی۔

اس ملاقات کے دوران علامہ کا قیام مہمان خانہ شاہی میں ہوا تھا اور علامہ کے ہمرکاب ڈاکٹر عبداللہ چغتائی، چودھری محمد حسین اور علی بخش تھے۔ (صفحہ ۳۵، ۴۰، ۴۱ تا ۴۳)

اس موقعہ پر اقبال نے اعلیٰ حضرت میر عثمان علی کی خدمت میں اپنی فارسی مثنوی ''رموزِ بے خودی'' کے ایک نسخہ کے ساتھ ''خطاب بہ تاجدارِ دکن'' کے عنوان سے مندرجہ ذیل نظم بھی پیش کی۔ (صفحہ ۶۷)

اے مقامت برتر از چرخِ بریں — از تو باقی سطوتِ دینِ مبیں
جلوہ صدیق از سیمائے تو — حافظِ ماتیغ جوشن خائے تو

از تُو مارا صُبح خنداں شامِ ہند | آستانت مرکزِ اسلامِ ہند
دوشِ ملت زندہ از امروزِ تو | تابِ ایں برقِ کہن از سوزِ تُو
بندگان ہستیم ما تو خواجہٗ | از پے فردائے ما دیباچہٗ
گوہرم را شوخیش بیباک کرد | تا گریبانِ صدف راچاک کرد

پیشِ سلطان ایں گہر آوردہ ام
قطرۂ خونِ جگر آوردہ ام

☆

جب اقبال دوسری بار ۱۹۲۹ء میں توسیعی لیکچروں کے سلسلے میں حیدرآباد دکن گئے تو جس طرح ان کا استقبال ہوا، اس کا حال ''اقبال اور حیدرآباد دکن'' کے مصنف نظر حیدرآبادی کی زبانی بھی سنیے:

''آپ ۱۴۔ جنوری کو حیدرآباد پہنچے، جہاں اسٹیشن پر ہی مسلمان بچے ایک قطار میں کھڑے ہوکر ''چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا'' کی نظم خوش الحانی کے ساتھ پڑھ رہے تھے۔ اسٹیشن پر عوام کے علاوہ عثمانیہ یونیورسٹی کے تمام ارکان موجود تھے۔ یہیں آپ کو اطلاع دی گئی کہ آپ نظام گورنمنٹ کے مہمان ہیں۔ اس لئے سیدھے گورنمنٹ مہمان خانہ میں جانا ہوگا۔

...... ۱۸۔ جنوری کی صبح کو ۱۱ بجے آپ اعلیٰ حضرت حضور نظام سے ملے۔ نظام سے اقبال کی یہ ملاقات نہایت دوستانہ ماحول میں ہوئی۔ نظام کے دربار میں جانے والوں کے لئے لازمی ہوتا تھا کہ وہ آصف جاہی ''دستار'' اور ''بگلس'' لگائیں، لیکن ہم نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ یہ ''پابندی'' اقبال پر سے ہٹالی گئی تھی۔ حیدرآباد میں پابندی سے ہندوستان کے گنتی کے چند مشاہیر مستثنیٰ

کیے گئے جن میں قائداعظم اور اقبال خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

اس موقع پر حسب ذیل فارسی اشعار اقبال نے نظام کو سنائے تھے جو انہی کے لئے کہے گئے تھے:

اے مقامت برتر از چرخِ بریں — از تو باقی سطوتِ دینِ مبیں
از تو مارا صبح خنداں شامِ ہند — آستانت مرکزِ اسلام ہند
دوشِ ملت زندہ از امروزِ تو — تاب ایں برقِ کہن از سوزِ او
بندگان ہستیم ما تو خواجۂ — از پے فردائے ما دیباچۂ
گوہرم را شوخیش بیباک کرد — تا گریبان صدف راچاک کرد

پیشِ سلطان ایں گہر آوردہ ام
قطرۂ خونِ جگر آوردہ ام

یہ قصیدہ نہیں بلکہ اس حقیقت کا اظہار ہے کہ برصغیر کے مسلمان مشاہیر حیدرآباد کو ''مرکزِ اسلام ہند'' سمجھتے تھے اور اسی لئے اس کی ترقی و خوشحالی اور آزادی کے لئے دست بدعا رہتے تھے۔ مشاہیر کی اس فہرست میں سرسیّد سے لے کر اقبال اور قائداعظم تک سبھی قابل ذکر رہنماؤں کے نام نظر آتے ہیں۔

اس موقع پر اقبال نے ''رموز بے خودی'' کا ایک نسخہ حضور نظام کی خدمت میں ہدیۃً پیش کیا تھا۔

اس ملاقات کا ایک دلچسپ پہلو وہ واقعہ ہے جو خود اقبال نے ڈاکٹر قاضی عبدالحمید سے بیان کیا۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

''علامہ موصوف کو قیمتی پتھروں، خصوصاً ہیروں سے، بہت دلچسپی تھی۔ اس لئے نہیں کہ ان کی مادی قیمت زائد ہے بلکہ اس لئے کہ اس میں شاعر کی نگاہ، حسنِ ازل کی ایک جھلک دیکھتی ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں انہوں نے ایک واقعہ بیان کیا کہ کس طرح ان کو حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم سے یہ خبر ملی تھی کہ اعلیٰ حضرت حضور نظام کے پاس ایک بیش بہا ہیرا ہے

جو نہایت چمکیلا ہے۔ جس وقت علامہ اقبال کی ملاقات اعلیٰ حضرت سے ہوئی تو انہوں نے اس ہیرے کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ اعلیٰ حضرت نے فوراً اس ہیرے کو منگوایا۔ اقبال نے پھر اس ہیرے کی چمک، اس کے وزن اور اس کے حسن کا مکمل تذکرہ کیا۔'' (صفحہ ۱۴ تا ۱۶)

☆

گزشتہ صفحات میں ذکر کیا جا چکا ہے کہ نظام سے ملاقات کے دوران اقبال نے نظام سے درخواست کی تھی کہ وہ آیندہ نومبر میں ''انجمن حمایت اسلام لاہور'' کے سالانہ جلسے کی صدارت کے لئے اپنے قدوم میمنت لزوم سے پنجاب کو سرفراز فرمائیں۔ نظام نے ان کی درخواست قبول کر لی تھی اور کہا کہ وہ جلد ہی اپنے فیصلے سے باخبر کر دیں گے۔

''رجالِ اقبال'' کے مؤلف عبدالرؤف عروج کے مطابق، لاہور پہنچنے کے بعد اقبال نے ''انجمن حمایت اسلام'' کی جنرل کونسل کے اجلاس کو نظام کی آمد سے متعلق اطلاع دی اور بتایا:

> ''اعلیٰ حضرت نظام سے مسلمانانِ پنجاب کو بہ حیثیت مسلمان فرمانروا ہونے کے دلی عقیدت ہے۔ اعلیٰ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی کی اولاد میں سے ہیں، چنیوٹ، پنجاب کے نواب سعد اللہ خاں وزیر اعظم شاہجہاں سے بھی اعلیٰ حضرت کو نسبتی تعلق ہے، ان خصوصیات کی بنا پر مسلمانانِ پنجاب کو اپنی عقیدت مندی کا ثبوت اعلیٰ حضرت کے شاندار خیر مقدم کے طور پر دینا لازمی ہے۔ مجھے حیدر آباد دکن جانے پر حضور نظام کے حضور میں باریابی کا شرف حاصل ہوا۔ بالمشافہ گفت و شنید میں، میں نے عرض کیا کہ مسلمانانِ پنجاب جناب کی تشریف آوری کے متمنی ہیں۔ اور عرصے سے چشم براہ ہیں کہ ان کی امید بر آئے، چنانچہ یہ گفتگو جناب کے پنجاب میں نومبر آیندہ میں تشریف لانے کا پیش خیمہ ہوئی۔''

اقبالؔ کے اس بیان کے بعد ایک مجلسِ استقبالیہ بنائی گئی جس میں مختلف امراء و رؤسا کو شامل کیا گیا۔ مزید تیاریاں جاری تھیں کہ نظام کا ایک ٹیلی گرام اقبالؔ کے نام آیا جس میں لکھا گیا تھا:

''آیندہ موسم سرما میں میری آمد کے متعلق میرے ہم مذہب باشندگانِ لاہور نے جن دوستانہ اور وفادارانہ جذبات کا اظہار کیا ہے، میرے دل میں ان کی بہت قدر ہے۔ میں اپنے ارادے سے بروقت اطلاع دوں گا۔''

اس کے کچھ دنوں بعد نظام نے ایک اور خط کے ذریعے اقبالؔ کو اطلاع دی:

''مجھے سردست اس بات کا یقین نہیں ہے کہ حسبِ توقع نومبر یا دسمبر میں وہاں آسکوں گا۔ اس لئے کہ میں اس سال کے خاتمے پر اپنے جواں عمر شہزادوں کی شادی پر غور کر رہا ہوں۔ علاوہ ازیں ہز ایکسیلینسی وائسرائے بھی دسمبر میں تشریف لا رہے ہیں۔ لہٰذا اندیشہ ہے کہ یہ واقعات میرے ارادے میں مزاحم ہوں۔ تاہم ستمبر یا اکتوبر میں قطعی طور پر اس معاملے میں اطلاع دے سکوں گا۔ فی الحال کوئی فیصلہ کن بات کہہ دینا قبل از وقت ہے اور یوں بھی ہنوز چھ مہینے کا وقفہ ہے۔''

اس کے چند مہینے بعد نظام نے بعض ناگزیر مجبوریوں کی بنا پر لاہور آنے سے معذرت کر دی۔'' (صفحہ ۳۶۶، ۳۶۷)

☆

میر عثمان علی خاں نظام دکن کی وفات حسرت آیات ۲۴۔ فروری ۱۹۶۷ء کو حیدر آباد دکن (حال بھارت) میں ہوئی اور وہیں آسودۂ خاک ہوئے۔ رہے نام اللہ جلّ جلالہ کا۔

ماخذ ....

(۱) ''دکن کا آخری تاجدار'' از محمد احمد خان مطبوعہ کراچی ۱۹۷۷ء مختلف صفحات۔

(۲) ''تذکرہ شعرائے جماعتیہ'' از محمد صادق قصوری مطبوعہ بُرج کلاں (قصور) ۲۰۰۶ء صفحہ ۹۶، ۹۷۔

(۳) ''زندہ رود'' از ڈاکٹر جاوید اقبال مطبوعہ لاہور ۲۰۰۴ء صفحہ ۴۳۲، ۴۳۳۔

(۴) ''اقبال اور حیدر آباد'' از نظر حیدر آبادی مطبوعہ لاہور طبع دوم ۱۹۸۱ء صفحہ ۱۳ تا ۱۶۔

(۵) ''رجال اقبال'' از عبدالرؤف عروج مطبوعہ کراچی ۱۹۸۸ء صفحہ ۳۶۵ تا ۳۶۷۔

(۶) ''جامع اردو انسائیکلوپیڈیا''، جلد اول مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور ۱۹۸۷ء صفحہ ۲۳۔

پروفیسر محمد طاہر فاروقیؒ

پروفیسر محمد طاہر فاروقی بن پروفیسر مولوی محمد محسن فاروقی کی ولادت ۱۴۔ ستمبر ۱۹۰۵ء کو رامپور (بھارت) کے ایک علم دوست گھرانے میں ہوئی۔ قرآن پاک کی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ اس دوران والد گرامی نے اپنے آبائی وطن بچھراؤں ضلع مراد آباد (یوپی) میں علاقہ کے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لئے ''مسلم اسکول'' کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا۔ آپ نے بھی اسی اسکول میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۱۴ء میں آپ کانپور چلے گئے جہاں آپ نے حلیم مسلم ہائی سکول اور مدرسہ دارالعلوم میں تعلیم حاصل کی۔ فخر ملت مولانا عبدالحامد بدایونیؒ جیسے جید عالم آپ کے ہم مکتب تھے۔ وہاں سے آپ نے مولانا نثار احمد کانپوریؒ جیسے اکابر علماء سے درس نظامی اور دورۂ حدیث کی تکمیل کی۔ ۱۹۲۰ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ''مولوی'' کا امتحان اول پوزیشن میں پاس کر کے انعام حاصل کیا۔

☆

۱۹۲۴ء میں آگرہ یونیورسٹی سے فارسی میں ایم اے کیا اور بحیثیت صدر شعبہ فارسی آگرہ کالج میں تقرری ہوگئی۔ ۱۹۴۴ء میں ایم اے اردو کیا۔ قیام پاکستان کے بعد ڈھاکہ یونیورسٹی، پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور، اسلامیہ کالج پشاور اور پشاور یونیورسٹی میں تعلیمی خدمات انجام دیں۔ ۱۹۶۸ء میں ریٹائر ہونے کے بعد انقرہ یونیورسٹی (ترکی) میں بحیثیت صدر شعبہ مطالعہ پاکستان تشریف لے گئے۔ ۱۹۷۰ء میں سبکدوش ہوکر واپس آگئے اور پھر تازیست پشاور میں مستقل طور پر مقیم ہوکر تصنیف و تالیف اور زہد و عبادت میں منہمک رہے۔

☆

پروفیسر فاروقی نے اوائل عمری میں ہی امیر ملّت حضرت پیر سیّد جماعت علی شاہ محدث علی پوری رحمۃ اللہ علیہ کے دستِ حق پر سعادتِ بیعت حاصل کرلی تھی۔ آپ کے دوعم زاد برادران پروفیسر عابد حسن فریدیؒ اور مولانا پروفیسر حامد حسن فریدیؒ تو حضرت امیر ملّتؒ کے اعاظم خلفاء میں سے تھے۔ اپنے شیخ سے غایت درجہ محبت تھی بلکہ فنافی الشیخ کے مقام پر فائز تھے۔ آپ نے پیرومرشد کی شان میں بے شمار قصیدے اور منقبیں لکھیں۔ ۶۔ دسمبر ۱۹۳۱ء کو جب سفرِ دکن سے واپسی پر حضرت امیر ملّتؒ آگرہ میں جلوہ افروز ہوئے تو آپ نے ۷۔ دسمبر کو "خیر مقدم" کے عنوان سے یہ نظم ان کی خدمت میں پیش کی جو انہوں نے پسند فرمائی اور دوبارہ سنانے کا ارشاد فرمایا۔

بھرا آج پھولوں سے صحنِ چمن ہے!!
گلِ لالہ خنداں بروئے دمن ہے

بہار اب کے آئی باسلوبِ دیگر!! — کہ ہر ایک کانٹے میں پھولا چمن ہے
یہ کس گل شمائم سے مہکا ہے گلشن!! — کہ صد چاک ہر پھول کا پیرہن ہے
یہ جلوؤں کی کس کے درخشانیاں ہیں!! — کہ ہر ذرہ اب رشکِ دُرِّ عدن ہے
یہ غربت کدہ کس کے فیضِ قدم سے!! — مسرت کا مسکن طرب کا وطن ہے

یہی مقتدا ہیں یہی میرِ مجلس
امامِ جماعت کی یہ انجمن ہے

یہ حافظ یہ قاری یہ حاجی یہ سیّد — بلا شبہ ذات ان کی فخرِ زمن ہے
نمونہ ہیں یہ سر سے پا تک نبیؐ کا — شجاعت علیؓ کی ہے خلقِ حسنؓ ہے
یہ مالک یہ صاحب یہ آقا یہ مولیٰ — غلاموں کا ان پر فدا جان وتن ہے
یہ حلقہ ہے حلقہ بگوشوں میں داخل — انہی کے درِ فیض کا حلقہ زن ہے
گرفتار رکھیں کہ آزاد کردیں! — انہی کا قفس ہے انہی کا چمن ہے
یہ آباد رکھیں کہ ویران کردیں! — انہی کا گلشن انہی کا یہ بن ہے

بڑا لطف ہے ان کے سایے میں ہم کو

نہ رنج و تعب ہے نہ حزن و محن ہے

مگر آج اس کی بھی تقدیر جاگی جو طاہرؔ سرِ بزم یوں نغمہ زن ہے

نگاہِ کرم کا ہے محتاج شاہا! گناہوں میں ڈوبا ہے اور خستہ تن ہے

مے لطف اس کے صلے میں عطا ہو

شرابِ عقیدت میں ڈوبا سخن ہے

☆

اقبالؒ کو حضرت امیر ملّت رحمۃ اللہ علیہ سے جو تعلق خاطر تھا، پروفیسر فاروقی اس سے غافل نہ تھے۔ لہٰذا انہوں نے بھی حکیم الامت سے ۱۹۳۴ء میں رابطہ کیا وہ یوں کہ ۲۱۔ ستمبر ۱۹۳۴ء کو ایرانی حکومت نے فردوسی کی ہزار سالہ جوبلی منانے کا اعلان کیا۔ علامہ اقبالؒ کو بھی اس جوبلی میں شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ پروفیسر طاہر فاروقی چاہتے تھے کہ کسی کا ساتھ ہو جائے تو وہ بھی ایران سے ہو آئیں۔ ان کو جب اس امر کی اطلاع ملی کہ اقبالؒ کو بھی اس جوبلی میں شرکت کی دعوت دی گئی ہے تو انہوں نے اقبالؒ کو خط لکھ کر اپنے ارادے کا اظہار کیا۔ اس زمانے میں اقبالؒ علیل تھے، بدیں وجہ وہ اپنی عملی زندگی سے معطل ہو گئے تھے، ان کی خواہش تھی کہ وہ ایران جا کر فردوسی کی ہزار سالہ جوبلی میں شرکت کریں لیکن ڈاکٹروں نے مکمل آرام کا مشورہ دیا اور سفر پر قدغن لگا دی تھی۔ اس پر اقبالؒ نے فاروقی صاحب کو لکھا:

''میں کچھ عرصے سے علیل ہوں، ناسازیٔ طبع کے باعث سفر کا ارادہ ملتوی کر چکا ہوں۔ قونصل جنرل ایران سے خط و کتابت کر کے جزئیات معلوم کر لیں۔'' (رجالِ اقبالؒ صفحہ ۳۱۸، ۳۱۹)

اقبالؒ کے اس خط کے بعد فاروقی صاحب نے ایران جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔

☆

۲۔ مئی ۱۹۳۸ء کو فاروقی صاحب نے حکیم الامت کی یادگار قائم کرنے کے لئے

آپ، قائداعظمؒ کو ساتھ لے کر حضرت امیر ملت رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ حضرت اقدس نے قائداعظمؒ کی شاہانہ دعوت کی اور پھر مسلم لیگ اور قائداعظمؒ کی کامیابی کے لئے دعا فرمائی۔ دعوت کے بعد شام کو قائداعظمؒ نے خاموشی کے ساتھ حضرت امیر ملت علیہ الرحمہ کے دستِ حق پرست پر بیعت کی سعادت بھی حاصل کر لی۔ یہی وجہ ہے کہ قائداعظم مکمل طور پر شریعت کے پابند ہو گئے تھے۔ اب آہِ سحر گاہی اور دعائے نیم شبی ان کا وظیفہ بن چکا تھا۔

☆

۲۷۔ جولائی ۱۹۴۶ء کو ''مسلم کانفرنس'' کے ایک خصوصی کنونشن میں (جس کی صدارت آپ نے کی) ''قراردادِ آزادیٔ کشمیر'' پاس کرتے ہوئے ریاست کے مسلمانوں کو اپنے مستقبل کا فیصلہ کرنے کا آزادانہ حق دینے کا مطالبہ کیا اور ساتھ ہی واضح کیا کہ اگر یہ مطالبہ تسلیم نہ ہوا تو ''مسلم کانفرنس'' پوری قوت سے آزادیٔ کشمیر کے لئے جدوجہد کرے گی۔ قرارداد کے منظور ہوتے ہی ڈوگرہ ایوان میں لرزہ طاری ہو گیا اور آپ کو گرفتار کر لیا گیا۔

آپ کے حکم کے مطابق ریاستی عوام نے پاکستان کے لئے بیش بہا قربانیاں دیں اور شیخ عبداللہ کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد نومبر ۱۹۴۷ء میں جموں میں لاکھوں مسلمانوں نے جامِ شہادت نوش کیا۔ قیامِ پاکستان کے وقت اگرچہ آپ جیل میں تھے مگر آپ کے دیوانوں اور پروانوں نے آپ کی اسیری اور قید و بند کے دوران ہی ''آزاد کشمیر'' کا علاقہ ڈوگرہ غلامی سے آزاد کرا لیا۔ ۱۹۴۸ء میں آپ قیدیوں کے تبادلہ میں پاکستان آ گئے تو قائداعظمؒ نے آپ کو آزاد کشمیر کا سپریم ہیڈ بنا دیا۔ آپ نے ہزاروں مہاجرین کے قافلوں کی دیکھ بھال اور آزاد کشمیر حکومت کی تشکیل کے لئے بے پناہ کام کیا۔

☆

قائداعظمؒ کی رحلت کے بعد حکمرانوں نے آپ کی خدمات کو یکسر فراموش کر کے آپ سے منہ موڑ لیا اور ہر لحاظ سے آپ کی حوصلہ شکنی کی گئی۔ اربابِ اقتدار و اختیار اور وزارت

امور کشمیر نے آپ سے جو ناروا رویہ اپنایا اور ذہنی اور فکری پریشانیاں دیں، اس سے انہیں کینسر کا نامراد اور موذی مرض لاحق ہوگیا مگر انتہائی نامساعد حالات کے باوجود کبھی بھی کسی حاکم کے سامنے سرنگوں نہیں کیا۔

؎ قوموں کی تقدیر وہ مردِ درویش
جس نے نہ ڈھونڈی سلطاں کی درگاہ

اس درویش منش عظیم رہنما نے پاکستان میں کوئی جائیداد بنانے کی بجائے ریاست جموں وکشمیر کا مستقبل پاکستان سے وابستہ کرنے کے لئے اپنی جوانی کو بڑھاپے میں تبدیل کیا۔ گوناگوں مصائب و آلام کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ انتہائی نامساعد حالات کا سامنا کرنے کے باوجود کشمیری مسلمانوں اور بالخصوص مسلم کانفرنس کے کارکنوں کو ہمیشہ یہی درس دیا کہ:

''غلام عباس پہلے پاکستانی ہے اور پھر کشمیری۔''

اے کاش! پاکستان کے اربابِ اقتدار و بست وکشاد قائد ملت رحمۃ اللہ علیہ کے مقام، مرتبہ، فکر اور مشن کو سمجھنے کی سعی و کوشش کرتے۔

☆

چودھری صاحب کو شروع سے ہی حضرت علامہ اقبالؒ سے خصوصی تعلق تھا۔ ۱۹۳۲ء میں انہوں نے ''آل جموں وکشمیر مسلم کانفرنس'' کے جنرل سیکرٹری کی حیثیت سے کشمیری مسلمانوں پر ڈوگرہ راج کے ہونے والے مظالم کی تفصیل بیان کرتے ہوئے اقبالؒ کی خدمت ایک طویل خط لکھا اور مالی امداد کی اپیل کی۔ ان کی اس اپیل پر حضرت اقبالؒ نے ایک خط کے ذریعے نواب بہادر یار جنگ کی توجہ اس مسئلہ کی جانب مبذول کراتے ہوئے لکھا:

''اس وقت حکومت کی طرف سے (کشمیری مسلمانوں پر) متعدد مقدمات چل رہے ہیں، جن کے اخراجات کی وجہ سے فنڈ کی نہایت ضرورت ہے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کی تھوڑی سی توجہ سے یہ مشکل حل ہوجائے گی۔''

چودھری صاحب کی حیاتِ طیبہ پر ایک عظیم کتاب ''قائد کشمیر'' کے مصنف بشیر احمد قریشی لکھتے ہیں کہ ''تحریکِ آزادیٔ کشمیر'' کی پہلی دہائی میں یعنی ۱۹۳۸ء تک چودھری صاحب اکثر مصور پاکستان شاعر مشرق حکیم الامت علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ سے صلاح و مشورہ اور ہدایات لینے کے لئے اکثر لاہور میں ان کی خدمت میں حاضر ہوتے رہتے۔ چند مرتبہ جناب اے آر ساغر بھی ان کے ہمراہ تھے۔ ساغر صاحب فرماتے ہیں کہ:

> ''حضرت علامہ کو تحریک کے سلسلہ میں چودھری صاحب پر مکمل اعتماد تھا۔ اور چودھری صاحب کی علامہ صاحب سے عقیدت کا یہ عالم تھا کہ جب بھی ملاقات کے بعد رخصت ہوتے تو پہلے ان کے ہاتھوں کو بوسہ دیتے اور پھر سلام کر کے الٹے پاؤں دروازے تک جاتے تاکہ علامہ اقبال کی طرف پیٹھ نہ ہو۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ قائد ملت کو حضرت علامہ کے سیاسی اور روحانی مرتبہ کا پورا علم تھا۔'' (صفحہ ۲۹۷، ۲۹۸)

☆

آخر عمر میں آپ کینسر جیسے موذی مرض کا شکار ہو گئے۔ بغرض علاج لندن بھی گئے مگر مرض بڑھتا گیا جوں جوں دوا کی۔ اور آخر کار اسلامیان کشمیر کا یہ عظیم اور محبوب رہنما، مرورِ ایام کی صاعقہ ریزیوں اور اپنوں کی زیادتیوں کا شکار ہو کر ۱۵۔ رمضان المبارک ۱۳۸۷ھ مطابق ۱۸۔ دسمبر ۱۹۶۷ء بروز پیر گیارہ بج کر چالیس منٹ پر ہمیشہ ہمیشہ کے لئے میٹھی نیند سو گیا، جس کی ساری زندگی حکیم الامتؒ کے اس شعر کی مکمل تصویر بنی رہی ۔

نگہ بلند سخن دلنواز، جاں پرسوز
یہی ہے رختِ سفر میر کارواں کے لئے

آپ کی آخری آرامگاہ ۱۹۔ دسمبر کو فیض آباد، راولپنڈی میں بنائی گئی جہاں ۶ بجے شام افطاری کے بعد سپرد خاک کر دیئے گئے۔ آپ کی وصیت کے مطابق قرآن پاک، جائے نماز

اور تسبیح ساتھ ہی دفن کردی گئی۔ ملک بھر کے اخبارات و رسائل اور مذہبی و سیاسی شخصیات نے بھرپور خراجِ تحسین پیش کیا۔ شعرائے کرام نے مرثیے اور قطعاتِ تاریخ وفات لکھے۔ جناب رئیس امروہوی نے مندرجہ ذیل ''قطعہ تاریخ وصال'' لکھ کر تو قلم ہی توڑ دیا۔

سکّہ فتح بنامِ عباس ‏ ‏ خطبۂ جنگ پیامِ عباس

قید کی شام تھی عباس کی صبح ‏ ‏ عزم کی صبح تھی شامِ عباس

آہ! وہ وادیٔ کشمیر کا شیر ‏ ‏ روضۂ خلد مقامِ عباس

زندگی عالم مرگِ مرحوم ‏ ‏ موت ہے عمرِ دوامِ عباس

اشک رودادِ زعیم کشمیر

آہ! ''عنوانِ غلامِ عباس''

............۱۳۸۷ھ............

............ماخذ............

(۱) ''کاروانِ تحریکِ پاکستان'' از محمد صادق قصوری مطبوعہ لاہور ۲۰۰۵ء صفحہ ۱۰۹ تا ۱۱۹۔

(۲) ''قائدِ کشمیر'' از بشیر احمد قریشی مطبوعہ مظفر آباد (آزاد کشمیر) طبع چہارم ۱۹۹۴ء متعدد صفحات۔

(۳) ''رجالِ اقبال'' از عبدالرؤف عروج مطبوعہ کراچی ۱۹۸۸ء صفحہ ۳۸۷۔

(۴) ''سیرتِ امیرِ ملّت'' از سیّد اختر حسین علی پوری مطبوعہ علی پور سیّداں ضلع سیال کوٹ ۱۹۷۵ء صفحہ ۴۸۴۔

(۵) ''حضرت امیرِ ملّتؒ اور تحریکِ پاکستان'' از محمد صادق قصوری مطبوعہ لاہور ۱۹۹۴ء صفحہ ۴۶۔

(۶) مجلّہ ''پتن'' گورنمنٹ ڈگری کالج بھمبر، آزاد کشمیر، ''چودھری غلام عباس نمبر'' ۱۹۹۰ء متعدد صفحات۔

(۷) ''اوراقِ پارینہ'' (کشمیر بات)، از خواجہ غلام احمد پنڈت مطبوعہ مظفر آباد (آزاد کشمیر)

سن ندارد ص ۴۲ تا ۵۱۔

(۸) ''کشمیر آزادی کی دہلیز پر'' (یادوں کے چراغ) از خواجہ غلام احمد پنڈت مطبوعہ جنگ پبلشرز لاہور ۱۹۹۱ء متعدد صفحات۔

(۹) ''اکابر تحریک پاکستان'' جلد دوم از محمد صادق قصوری مطبوعہ لاہور ۱۹۷۹ء صفحہ ۲۱۰ تا ۲۱۶۔

(۱۰) ''شہاب نامہ'' از قدرت اللہ شہاب مطبوعہ لاہور طبع یازدہم ۱۹۹۲ء متعدد صفحات۔

☆

نواب میر عثمان علی خاںؒ نظامِ حیدرآباد دکن

نواب میر عثمان علی خاں آصف جاہ ہفتم بن نواب میر محبوب علی خاں آصف جاہ سادس ۶۔اپریل ۱۸۸۶ء کو حیدرآباد دکن میں پیدا ہوئے۔ مولانا انوار اللہ خان فضیلت جنگ اور عماد الملک سیّد حسین بلگرامی جیسے صاحبانِ علم و فضل سے فیضِ صحبت و تربیت حاصل ہوا۔ اور فارسی، اردو اور مشرقی اور دینی علوم کی تعلیم پائی۔ ساتھ ہی ساتھ سرافسرالملک کمانڈر افواج سے شہسواری اور فنونِ حرب کی تربیت حاصل کی۔ ۲۸۔ اگست ۱۹۱۱ء کو سریر آرائے سلطنت ہوئے۔

☆

میر عثمان علی خاں کی پہلی بیعت حضرت مولانا خیر المبین صدیقی قادریؒ آف حیدرآباد دکن سے تھی۔ ۱۹۲۲ء میں ان کی رحلت کے بعد امیر ملت پیر سیّد جماعت علی شاہ محدث علی پوری قدس سرہ العزیز سے شرفِ بیعت حاصل کیا۔ میر صاحب کو حضرت اقدس سے بے پناہ عقیدت و محبت تھی اور حضرت بھی خصوصی شفقت فرماتے تھے۔ میر صاحب اردو اور فارسی میں شاعری بھی کرتے تھے۔ جلیلؔ مانکپوری سے شرف تلمذ تھا۔ ماہنامہ ''انوار الصوفیہ'' لاہور اور سیال کوٹ میں ان کا کلام چھپتا تھا۔ پیرو مرشد کے ارشاد پر برصغیر کے متعدد مذہبی، تعلیمی اور رفاہی اداروں کے ماہانے اور سالانے مقرر کئے گئے تھے۔

☆

حکیم الامت علامہ اقبالؒ نے دو دفعہ حیدرآباد دکن کا سفر اختیار فرمایا۔ پہلی دفعہ ۱۹۱۰ء اور دوسری دفعہ ۱۹۲۹ء میں۔ حضرت علامہؒ کے فرزند گرامی ڈاکٹر جاوید اقبال لکھتے ہیں:

''۱۳۔ جنوری ۱۹۲۹ء کو صبح ساڑھے آٹھ بجے اقبالؔ بنگلور سے حیدرآباد دکن روانہ ہوئے۔ وہاں عثمانیہ یونیورسٹی میں لیکچروں کی دعوت تھی جو انہوں نے قبول کر لی تھی۔ ۱۴۔ جنوری کو جب گاڑی حیدرآباد کے سٹیشن پر رکی تو پلیٹ فارم پر سینکڑوں مسلمان بچے اقبال کا کلام خوش الحانی سے پڑھ رہے تھے۔ عثمانیہ یونیورسٹی کے رجسٹرار انصاری و دیگر اصحاب یہیں سے ساتھ ہو لئے۔ انہوں نے اقبالؔ کو مطلع کیا کہ وہ حیدرآباد میں حکومتِ نظام کے مہمان ہوں گے۔ لہٰذا انہیں سرکاری گیسٹ ہاؤس میں ٹھہرنا ہوگا۔ اگلے سٹیشن سکندرآباد پر اترنا تھا، جب وہاں پہنچے تو سر اکبر حیدری، ڈاکٹر خلیفہ عبدالحکیم، مولانا عبداللہ عمادی، سید ابراہیم، ڈاکٹر مظفر الدین قریشی اور عثمانیہ یونیورسٹی کے دیگر اساتذہ استقبال کے لئے موجود تھے۔ دستور کے مطابق اقبال کو پھولوں کے ہار پہنائے گئے۔ اس کے بعد وہ سر اکبر حیدری کے ہمراہ گیسٹ ہاؤس میں پہنچ گئے۔

۱۴۔ جنوری تا ۱۸۔ جنوری حیدرآباد میں قیام، ۱۵۔ جنوری کو پہلا لیکچر، ۱۷۔ کو دوسرا لیکچر ہوا۔ ۱۸۔ جنوری کو صبح گیارہ بجے اقبالؔ، نظام سے ملے۔ نظام کے دربار جانے والوں کے لئے لازمی ہوتا تھا کہ وہ آصف جاہی دستار اور بگلس لگائیں لیکن اقبال پر کوئی پابندی نہ تھی۔ اقبالؔ نے ملاقات کے دوران نظام کو ''انجمن حمایت اسلام'' (لاہور) کے آئندہ سالانہ جلسے کی صدارت کے لئے لاہور آنے کی دعوت دی جو نظام نے قبول کر لی۔ اس سلسلے میں بعد میں اقبالؔ کی نظام کے ساتھ خط وکتابت بھی ہوئی، لیکن بالآخر نظام اپنی بعض ناگزیر مجبوریوں کے سبب لاہور نہ آسکے۔ ۱۹۔ جنوری کو اقبالؔ، حیدرآباد سے لاہور روانہ ہوئے۔ (''زندہ رود صفحہ ۴۳۲، ۴۳۳)

''ارمغانِ دکن'' کے مصنف محمد احمد خان لکھتے ہیں:

علامہ اقبالؔ نے حیدر آباد دکن کا پہلا سفر ۱۹۱۰ء میں کیا اور دوسری اور آخری بار جنوری ۱۹۲۹ء میں حیدر آباد دکن تشریف لے گئے۔ انہیں جامعہ عثمانیہ کی جانب سے فلسفہ پر توسیعی تقاریر کے سلسلہ میں مدعو کیا گیا تھا۔ ۱۵۔ جنوری ۱۹۲۹ء کو ٹاؤن ہال میں ان کی پہلی تقریر ہوئی، جس کی صدارت مہاراجہ کرشن پرشاد نے کی اور دوسرے لیکچرر کی صدارت دکن کے فاضلِ بے بدل سر امین جنگ نے فرمائی۔ لیکچر کے آغاز سے پہلے سر امین جنگ نے موقعہ کی مناسبت سے حضرت علامہ کا یہ شعر پڑھا۔

غلامِ ہمتِ آں خود پرستم
کہ از نورِ خودی بیند خدارا

اس موقعہ پر حضرت علامہ کے اعزاز میں ایک مشاعرہ بھی منعقد ہوا تھا، جس میں حیدر آباد کے تمام اردو و فارسی شعراء مدعو تھے۔ مشاعرہ کے بعد جب علامہ، حضور نظام سے ملنے کے لئے گئے تو جناب خلیفہ عبدالحکیم بھی ان کے ہمراہ تھے۔ پہلے تو حسبِ قاعدہ وہ محل کی کتابِ حضوری میں اپنا نام لکھ کر واپس ہوگئے۔ جب یہ کتاب حضور نظام کے ملاحظہ میں پیش ہوئی تو حکم ہوا کہ علامہ کو بلایا جائے۔ چنانچہ ہرکارہ دوڑا اور علامہ کو فرمانِ شاہی کی خبر دی۔ علامہ واپس کنگ کوٹھی تشریف لے گئے اور حضور نظام سے ملاقات کی۔

اس ملاقات کے دوران علامہ کا قیام مہمان خانہ شاہی میں ہوا تھا اور علامہ کے ہمرکاب ڈاکٹر عبداللہ چغتائی، چودھری محمد حسین اور علی بخش تھے۔ (صفحہ ۳۵، ۴۰، ۴۱ تا ۴۳)

اس موقعہ پر اقبال نے اعلیٰ حضرت میر عثمان علی کی خدمت میں اپنی فارسی مثنوی ''رموزِ بے خودی'' کے ایک نسخہ کے ساتھ ''خطاب بہ تاجدارِ دکن'' کے عنوان سے مندرجہ ذیل نظم بھی پیش کی۔ (صفحہ ۶۷)

اے مقامت برتر از چرخِ بریں — از تو باقی سطوتِ دینِ مبیں
جلوہ صدیق از سیمائے تو — حافظِ ما تیغ جوشن خائے تو

از تو مارا صُبح خنداں شامِ ہند آستانت مرکزِ اسلامِ ہند
دوشِ ملت زندہ از امروزِ تو تابِ ایں برقِ کہن از سوزِ تو
بندگان ہستیم ما تو خواجۂ از پے فردائے ما دیباچۂ
گوہرم را شوخیش بیباک کرد تا گریبانِ صدف راچاک کرد

پیشِ سلطان ایں گہر آوردہ ام
قطرۂ خونِ جگر آوردہ ام

☆

جب اقبال دوسری بار ۱۹۲۹ء میں توسیعی لیکچروں کے سلسلے میں حیدرآباد دکن گئے تو جس طرح ان کا استقبال ہوا، اس کا حال ''اقبال اور حیدرآباد دکن'' کے مصنف نظر حیدرآبادی کی زبانی بھی سنیئے:

''آپ ۱۴۔ جنوری کو حیدرآباد پہنچے، جہاں اسٹیشن پر ہی مسلمان بچے ایک قطار میں کھڑے ہوکر ''چین و عرب ہمارا ہندوستاں ہمارا'' کی نظم خوش الحانی کے ساتھ پڑھ رہے تھے۔ اسٹیشن پر عوام کے علاوہ عثمانیہ یونیورسٹی کے تمام ارکان موجود تھے۔ یہیں آپ کو اطلاع دی گئی کہ آپ نظام گورنمنٹ کے مہمان ہیں۔ اس لئے سیدھے گورنمنٹ مہمان خانہ میں جانا ہوگا۔

...... ۱۸۔ جنوری کی صبح کو ۱۱ بجے آپ اعلیٰ حضرت حضور نظام سے ملے۔ نظام سے اقبال کی یہ ملاقات نہایت دوستانہ ماحول میں ہوئی۔ نظام کے دربار میں جانے والوں کے لیئے لازمی ہوتا تھا کہ وہ آصف جاہی ''دستار'' اور ''دبگلس'' لگائیں، لیکن ہم نے اپنے بزرگوں سے سنا ہے کہ یہ ''پابندی'' اقبال پر سے ہٹالی گئی تھی۔ حیدرآباد میں پابندی سے ہندوستان کے گنتی کے چند مشاہیر مستثنٰی

کیے گئے جن میں قائداعظم اور اقبال خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔

اس موقع پر حسب ذیل فارسی اشعار اقبال نے نظام کو سنائے تھے جو انہی کے لئے کہے گئے تھے:

اے مقامت برتر از چرخِ بریں — از تو باقی سطوتِ دینِ مبیں
از تو مارا صبح خنداں شامِ ہند — آستانت مرکزِ اسلام ہند
دوشِ ملت زندہ از امروزِ تو — تاب ایں برقِ کہن از سوزِ او
بندگان ہستم ما تو خواجۂ — از پے فردائے ما دیباچۂ
گوہرم را شوخیش بیباک کرد — تا گریبان صدف راچاک کرد

پیشِ سلطان ایں گہر آوردہ ام
قطرۂ خونِ جگر آوردہ ام

یہ قصیدہ نہیں بلکہ اس حقیقت کا اظہار ہے کہ برصغیر کے مسلمان مشاہیر حیدرآباد کو ''مرکزِ اسلام ہند'' سمجھتے تھے اور اسی لئے اس کی ترقی وخوشحالی اور آزادی کے لئے دست بدعا رہتے تھے۔ مشاہیر کی اس فہرست میں سرسیّد سے لے کر اقبال اور قائداعظم تک سبھی قابل ذکر رہنماؤں کے نام نظر آتے ہیں۔

اس موقع پر اقبال نے ''رموز بے خودی'' کا ایک نسخہ حضور نظام کی خدمت میں ہدیۃً پیش کیا تھا۔

اس ملاقات کا ایک دلچسپ پہلو وہ واقعہ ہے جو خود اقبال نے ڈاکٹر قاضی عبدالحمید سے بیان کیا۔ ڈاکٹر صاحب لکھتے ہیں:

''علامہ موصوف کو قیمتی پتھروں، خصوصاً ہیروں سے بہت دلچسپی تھی۔ اس لئے نہیں کہ ان کی مادی قیمت زائد ہے بلکہ اس لئے کہ اس میں شاعر کی نگاہ، حسن ازل کی ایک جھلک دیکھتی ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں انہوں نے ایک واقعہ بیان کیا کہ کس طرح ان کو حکیم اجمل خاں صاحب مرحوم سے یہ خبر ملی تھی کہ اعلیٰ حضرت حضور نظام کے پاس ایک بیش بہا ہیرا ہے

جو نہایت چمکیلا ہے۔ جس وقت علامہ اقبال کی ملاقات اعلیٰ حضرت سے ہوئی تو انہوں نے اس ہیرے کو دیکھنے کی خواہش ظاہر کی۔ اعلیٰ حضرت نے فوراً اس ہیرے کو منگوایا۔ اقبال نے پھر اس ہیرے کی چمک، اس کے وزن اور اس کے حسن کا مکمل تذکرہ کیا۔'' (صفحہ ۱۳ تا ۱۶)

☆

گزشتہ صفحات میں ذکر کیا جا چکا ہے کہ نظام سے ملاقات کے دوران اقبال نے نظام سے درخواست کی تھی کہ وہ آیندہ نومبر میں ''انجمن حمایت اسلام لاہور'' کے سالانہ جلسے کی صدارت کے لئے اپنے قدوم میمنت لزوم سے پنجاب کو سرفراز فرمائیں۔ نظام نے ان کی درخواست قبول کر لی تھی اور کہا کہ وہ جلد ہی اپنے فیصلے سے باخبر کر دیں گے۔

''رجال اقبال'' کے مؤلف عبدالرؤف عروج کے مطابق، لاہور پہنچنے کے بعد اقبال نے ''انجمن حمایت اسلام'' کی جنرل کونسل کے اجلاس کو نظام کی آمد سے متعلق اطلاع دی اور بتایا:

> ''اعلیٰ حضرت نظام سے مسلمانانِ پنجاب کو بہ حیثیت مسلمان فرمانروا ہونے کے دلی عقیدت ہے۔ اعلیٰ حضرت شیخ شہاب الدین سہروردی کی اولاد میں سے ہیں، چنیوٹ، پنجاب کے نواب سعد اللہ خاں وزیر اعظم شاہجہاں سے بھی اعلیٰ حضرت کو نسبتی تعلق ہے، ان خصوصیات کی بنا پر مسلمانانِ پنجاب کو اپنی عقیدت مندی کا ثبوت اعلیٰ حضرت کے شاندار خیر مقدم کے طور پر دینا لازمی ہے۔ مجھے حیدر آباد دکن جانے پر حضور نظام کے حضور میں باریابی کا شرف حاصل ہوا۔ بالمشافہ گفت و شنید میں، میں نے عرض کیا کہ مسلمانانِ پنجاب جناب کی تشریف آوری کے متمنی ہیں۔ اور عرصے سے چشم براہ ہیں کہ ان کی امید برآئے، چنانچہ یہ گفتگو جناب کے پنجاب میں نومبر آیندہ میں تشریف لانے کا پیش خیمہ ہوئی۔''

اقبالؔ کے اس بیان کے بعد ایک مجلسِ استقبالیہ بنائی گئی جس میں مختلف امراء و روٴسا کو شامل کیا گیا۔ مزید تیاریاں جاری تھیں کہ نظام کا ایک ٹیلی گرام اقبالؔ کے نام آیا جس میں لکھا گیا تھا:

''آئندہ موسم سرما میں میری آمد کے متعلق میرے ہم مذہب باشندگانِ لاہور نے جن دوستانہ اور وفادارانہ جذبات کا اظہار کیا ہے، میرے دل میں ان کی بہت قدر ہے۔ میں اپنے ارادے سے بروقت اطلاع دوں گا۔''

اس کے کچھ دنوں بعد نظام نے ایک اور خط کے ذریعے اقبالؔ کو اطلاع دی:

''مجھے سردست اس بات کا یقین نہیں ہے کہ حسبِ توقع نومبر یا دسمبر میں وہاں آسکوں گا۔ اس لئے کہ میں اس سال کے خاتمے پر اپنے جواں عمر شہزادوں کی شادی پر غور کر رہا ہوں۔ علاوہ ازیں ہز ایکسیلینسی وائسرائے بھی دسمبر میں تشریف لا رہے ہیں۔ لہٰذا اندیشہ ہے کہ یہ واقعات میرے ارادے میں مزاحم ہوں۔ تاہم ستمبر یا اکتوبر میں قطعی طور پر اس معاملے میں اطلاع دے سکوں گا۔ فی الحال کوئی فیصلہ کن بات کہہ دینا قبل از وقت ہے اور یوں بھی ہنوز چھ مہینے کا وقفہ ہے۔''

اس کے چند مہینے بعد نظام نے بعض ناگزیر مجبوریوں کی بنا پر لاہور آنے سے معذرت کر دی۔'' (صفحہ ۳۶۶، ۳۶۷)

☆

میر عثمان علی خاں نظام دکن کی وفات حسرت آیات ۲۴۔ فروری ۱۹۶۷ء کو حیدر آباد دکن (حال بھارت) میں ہوئی اور وہیں آسودۂ خاک ہوئے۔ رہے نام اللہ جلّ جلالہ کا۔

.... ماخذ ....

(۱) ''دکن کا آخری تاجدار'' از محمد احمد خان مطبوعہ کراچی ۱۹۷۷ء مختلف صفحات۔

(۲) ''تذکرہ شعرائے جماعتیہ'' از محمد صادق قصوری مطبوعہ بُرج کلاں (قصور) ۲۰۰۶ء صفحہ ۹۶، ۹۷۔

(۳) ''زندہ رود'' از ڈاکٹر جاوید اقبال مطبوعہ لاہور ۲۰۰۴ء صفحہ ۴۳۲ صفحہ ۴۳۲، ۴۳۳۔

(۴) ''اقبال اور حیدر آباد'' از نظر حیدر آبادی مطبوعہ لاہور طبع دوم ۱۹۸۱ء صفحہ ۱۳ تا ۱۶۔

(۵) ''رجال اقبال'' از عبدالرؤف عروج مطبوعہ کراچی ۱۹۸۸ء صفحہ ۳۶۵ تا ۳۶۷۔

(۶) ''جامع اردو انسائیکلوپیڈیا''، جلد اول مطبوعہ شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور ۱۹۸۷ء صفحہ ۲۳۔

☆

پروفیسر محمد طاہر فاروقیؒ

پروفیسر محمد طاہر فاروقی بن پروفیسر مولوی محمد محسن فاروقی کی ولادت ۱۴۔ ستمبر ۱۹۰۵ء کو رامپور (بھارت) کے ایک علم دوست گھرانے میں ہوئی۔ قرآن پاک کی تعلیم گھر پر حاصل کی۔ اس دوران والد گرامی نے اپنے آبائی وطن بچھراوں ضلع مراد آباد (یوپی) میں علاقہ کے بچوں کی تعلیم و تربیت کے لئے ''مسلم اسکول'' کے نام سے ایک ادارہ قائم کیا۔ آپ نے بھی اسی اسکول میں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ ۱۹۱۴ء میں آپ کانپور چلے گئے جہاں آپ نے حلیم مسلم ہائی سکول اور مدرسہ دارالعلوم میں تعلیم حاصل کی۔ فخر ملت مولانا عبدالحامد بدایونیؒ جیسے جید عالم آپ کے ہم مکتب تھے۔ وہاں سے آپ نے مولانا نثار احمد کانپوریؒ جیسے اکابر علماء سے درس نظامی اور دورۂ حدیث کی تکمیل کی۔ ۱۹۲۰ء میں پنجاب یونیورسٹی سے ''مولوی'' کا امتحان اول پوزیشن میں پاس کر کے انعام حاصل کیا۔

☆

۱۹۲۴ء میں آگرہ یونیورسٹی سے فارسی میں ایم اے کیا اور بحیثیت صدر شعبہ فارسی آگرہ کالج میں تقرری ہوگئی۔ ۱۹۴۴ء میں ایم اے اردو کیا۔ قیام پاکستان کے بعد ڈھاکہ یونیورسٹی، پنجاب یونیورسٹی اورینٹل کالج لاہور، اسلامیہ کالج پشاور اور پشاور یونیورسٹی میں تعلیمی خدمات انجام دیں۔ ۱۹۶۸ء میں ریٹائر ہونے کے بعد انقرہ یونیورسٹی (ترکی) میں بحیثیت صدر شعبہ مطالعہ پاکستان تشریف لے گئے۔ ۱۹۷۰ء میں سبکدوش ہوکر واپس آگئے اور پھر تازیست پشاور میں مستقل طور پر مقیم ہوکر تصنیف و تالیف اور زہد و عبادت میں منہمک رہے۔

☆

پروفیسر فاروقی نے اوائل عمری میں ہی امیر ملّت حضرت پیر سیّد جماعت علی شاہ محدث علی پوری رحمۃ اللہ علیہ کے دستِ حق پر سعادتِ بیعت حاصل کرلی تھی۔ آپ کے دوعم زاد برادران پروفیسر عابد حسن فریدیؒ اور مولانا پروفیسر حامد حسن فریدیؒ تو حضرت امیر ملّتؒ کے اعاظم خلفاء میں سے تھے۔ اپنے شیخ سے غایت درجہ محبت تھی بلکہ فنافی الشیخ کے مقام پر فائز تھے۔ آپ نے پیرو مرشد کی شان میں بے شمار قصیدے اور منقبتیں لکھیں۔ ۶۔ دسمبر ۱۹۳۱ء کو جب سفر دکن سے واپسی پر حضرت امیر ملّتؒ آگرہ میں جلوہ افروز ہوئے تو آپ نے ۷۔ دسمبر کو ''خیر مقدم'' کے عنوان سے یہ نظم ان کی خدمت میں پیش کی جو انہوں نے پسند فرمائی اور دوبارہ سنانے کا ارشاد فرمایا۔

بھرا آج پھولوں سے صحنِ چمن ہے!!
گلِ لالہ خنداں بروئے دمن ہے

بہار اب کے آئی باسلوبِ دیگر!! | کہ ہر ایک کانٹے میں پھولا چمن ہے
یہ کس گل شمایم سے مہکا ہے گلشن!! | کہ صد چاک ہر پھول کا پیرہن ہے
یہ جلووں کی کس کے درخشانیاں ہیں!! | کہ ہر ذرہ اب رشکِ دُرِ عدن ہے
یہ غربت کدہ کس کے فیضِ قدم سے!! | مسرت کا مسکن طرب کا وطن ہے

یہی مقتدا ہیں یہی میرِ مجلس
امامِ جماعت کی یہ انجمن ہے

یہ حافظ یہ قاری یہ حاجی یہ سیّد | بلا شبہ ذات ان کی فخرِ زمن ہے
نمونہ ہیں یہ سر سے پا تک نبیؐ کا | شجاعت علیؓ کی ہے خلقِ حسنؓ ہے
یہ مالک یہ صاحب یہ آقا یہ مولیٰ | غلاموں کا ان پر فدا جان وتن ہے
یہ حلقہ ہے حلقہ بگوشوں میں داخل | انہی کے درِ فیض کا حلقہ زن ہے
گرفتار رکھیں کہ آزاد کردیں! | انہی کا قفس ہے انہی کا چمن ہے
یہ آباد رکھیں کہ ویران کردیں! | انہی کا گلشن انہی کا یہ بن ہے

بڑا لطف ہے ان کے سایے میں ہم کو
نہ رنج و تعب ہے نہ حزن و محن ہے
مگر آج اس کی بھی تقدیر جاگی — جو طاہر سرِ بزم یوں نغمہ زن ہے
نگاہِ کرم کا ہے محتاج شاہا! — گناہوں میں ڈوبا ہے اور خستہ تن ہے
مے لطف اس کے صلے میں عطا ہو
شرابِ عقیدت میں ڈوبا سخن ہے

☆

اقبالؒ کو حضرت امیر ملت رحمۃ اللہ علیہ سے جو تعلق خاطر تھا، پروفیسر فاروقی اس سے غافل نہ تھے۔ لہٰذا انہوں نے بھی حکیم الامت سے ۱۹۳۴ء میں رابطہ کیا وہ یوں کہ ۲۱۔ ستمبر ۱۹۳۴ء کو ایرانی حکومت نے فردوسیؔ کی ہزار سالہ جوبلی منانے کا اعلان کیا۔ علامہ اقبالؔ کو بھی اس جوبلی میں شرکت کی دعوت دی گئی تھی۔ پروفیسر طاہر فاروقی چاہتے تھے کہ کسی کا ساتھ ہو جائے تو وہ بھی ایران سے ہو آئیں۔ ان کو جب اس امر کی اطلاع ملی کہ اقبالؒ کو بھی اس جوبلی میں شرکت کی دعوت دی گئی ہے تو انہوں نے اقبالؔ کو خط لکھ کر اپنے ارادے کا اظہار کیا۔ اس زمانے میں اقبالؔ علیل تھے، بدیں وجہ وہ اپنی عملی زندگی سے معطل ہو گئے تھے، ان کی خواہش تھی کہ وہ ایران جا کر فردوسی کی ہزار سالہ جوبلی میں شرکت کریں لیکن ڈاکٹروں نے مکمل آرام کا مشورہ دیا اور سفر پر قدغن لگا دی تھی۔ اس پر اقبالؔ نے فاروقی صاحب کو لکھا:

''میں کچھ عرصے سے علیل ہوں، ناسازیٔ طبع کے باعث سفر کا ارادہ ملتوی کر چکا ہوں۔ قونصل جنرل ایران سے خط و کتابت کر کے جزئیات معلوم کر لیں۔'' (رجالِ اقبالؔ صفحہ ۳۱۸، ۳۱۹)

اقبالؒ کے اس خط کے بعد فاروقی صاحب نے ایران جانے کا ارادہ ترک کر دیا۔

☆

۲۔ مئی ۱۹۳۸ء کو فاروقی صاحب نے حکیم الامت کی یادگار قائم کرنے کے لئے

حضرت سیماب اکبر آبادی اور میکش اکبر آبادی کے تعاون سے آگرہ میں ''بزمِ اقبالؒ'' کی بنیاد رکھی، جس کا مقصد قیام ''پیام کلامِ اقبالؒ کی ترویج و اشاعت'' تھا۔ اقبال سیشن میں پڑھے گئے مقالات و منظومات کو فاروقی صاحب نے مرتب کر کے ۱۹۴۴ء میں آگرہ سے کتابی صورت میں ''بزمِ اقبالؒ'' کے نام سے شائع کرایا۔

☆

۲۱۔ اپریل ۱۹۳۸ء کو اقبالؒ کی رحلت ہوئی تو ان پر سب سے پہلی کتاب ''سیرت اقبالؒ'' کے نام سے فاروقی صاحب نے ہی لکھی۔ ۱۸۔ جولائی ۱۹۳۸ء کو انہوں نے اس کتاب کا مسودہ مکمل کر لیا تھا۔ جنوری ۱۹۳۹ء میں اس کا پہلا ایڈیشن قومی کتب خانہ ریلوے روڈ لاہور سے طبع ہوا۔ دوسرا ایڈیشن ۱۹۴۴ء میں، تیسرا ۱۹۴۹ء میں، چوتھا ۱۹۶۶ء میں اور پانچواں ایڈیشن ۱۹۷۸ء میں چھپا۔ ہمارے پیش نظر چوتھا ایڈیشن ہے جو پانچ صد اٹھائیس صفحات پر مشتمل ہے۔ نامعلوم اس کے بعد کتنے ایڈیشن منصہ شہود پر جلوہ گر ہو چکے ہوں۔

☆

۱۹۶۵ء میں شعبہ اردو جامعہ پشاور کے زیرِ اہتمام ''یوم اقبالؒ'' نہایت اعلیٰ پیمانہ پر منایا گیا تو اس میں لاہور اور کراچی کے سکالر حضرات تشریف لائے۔ (ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، ڈاکٹر محمود حسین خان کراچی اور ڈاکٹر وحید قریشی اور پروفیسر حمید احمد خاں لاہور سے)۔ اس موقعہ پر پروفیسر حمید احمد خاں نے کہا:

> ''فاروقی صاحب اقبالؒ کے پہلے ناقد ہیں اور انہوں نے اپنی کتاب (سیرت اقبالؒ) اس وقت لکھی جب کسی کے ذہن میں اقبالیات پر لکھنے کا خیال بھی پیدا نہیں ہوا تھا۔''

☆

پروفیسر محمد طاہر فاروقی کو حکیم الامت اقبالؒ سے جو والہانہ عقیدت و محبت تھی وہ ان کی مایہ ناز کتاب ''سیرت اقبالؒ'' کے تعارف سے عیاں و بیاں ہے۔ طبع چہارم پر تعارف (طبع دوم) کا ایک اقتباس ملاحظہ فرمایئے:

''علامہ سر اقبالؔ رحمۃ اللہ علیہ ان برگزیدہ ہستیوں میں سے تھے جو صدیوں بعد پیدا ہوا کرتی ہیں۔ علامہ سیّد جمال الدین افغانی، علامہ مفتی محمد عبدہ رحمۃ اللہ علیہما کے بعد اقبالؔ ہی واحد شخص تھے جنہوں نے عالمِ مشرق کو بیدار کرنے اور انسانیت کو ایک مرکز پر لانے کے لئے آواز بلند کی۔ اقبالؔ کی موت مشرق کے لئے اس صدی کا سب سے بڑا نا قابل تلافی حادثہ ہے۔ اور یہ کہنا بالکل بجا ہے۔

فَمَا كَانَ قَيْسٌ هُلْكُهُ هُلْكَ وَاحِدٍ
وَلٰكِنَّهُ بُنْيَانُ قَوْمٍ تَهَدَّمَا

☆

بحیثیت صدر شعبہ اردو پشاور یونیورسٹی، شعبہ کے مجلّہ ''خیابان'' کا ''اقبالؔ نمبر'' ۱۹۶۲ء میں شائع کرایا۔ شریک مدیر پروفیسر خاطر غزنوی استاد شعبہ اردو تھے۔ یہ نمبر بہت مقبول ہوا۔ افادیت اور مانگ کے پیش نظر ۱۹۶۶ء میں کتابی شکل میں ''خیابانِ اقبالؔ'' کے نام سے یونیورسٹی بک ایجنسی پشاور نے اسے زیور طباعت سے آراستہ کیا۔ یہ فاروقی صاحب کا ''اقبالیات'' کے ضمن میں بہت بڑا کارنامہ ہے۔

☆

پروفیسر محمد طاہر فاروقی کو کلامِ اقبالؒ سے کتنا شغف تھا، وہ ذیل میں اقبالؒ کے ایک مصرعہ'' کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا'' پر ان کی تضمین سے مترشح ہے۔

نویدِ امن و راحت رحمۃ للعالمینؐ لائے	بشارتِ نوعِ انساں کو ہوئے خیر البشرؐ پیدا
وہ جس نے عالمِ ایجاد کی تاریکیاں دھوئیں	وہ جس نے شامِ ظلمت میں کیا نورِ سحر پیدا
وہ جس نے سارے عالم کو نوید اوج و رفعت دی	خزف پاروں میں جس نے کردیئے لعل و گہر پیدا
وہ جس نے بینواؤں کو سلیمانی عطا کی تھی،	غلاموں میں کیا تھا جس نے شاہوں کا جگر پیدا

ثبات وعزم وخودداری کے سب آئین سکھائے تھے
تن بے جاں میں شاہیں کے کئے تھے بال و پر پیدا

وہی ان خاک کے ذرّوں کو پھر پارس بنائیں گے
انھی کے اک اشارے سے ہوئے تھے دوقمر پیدا

یہ مرجھائی ہوئی کھیتی مگر پھر سے لہلائے گی،
خزاں دیدہ چمن میں ہوں گے پھر برگ وثمر پیدا

وہ پھر امت کی یہ ڈوبی ہوئی کشتی ترائیں گے
اسی طوفاں میں ہوجائے گی کوئی رہِ گذر پیدا

زمانے کو سبق پھر خالدیت کا سکھانے کو
اسی بیشے میں ہوں گے اور بھی کچھ شیرِ نر پیدا

انہی میں پھر حسینؓ وحیدرؓ کرار آئیں گے،
اسی امت میں ہوں گے پھر ابوبکرؓ وعمرؓ پیدا

یقیں ہے ملتِ مردہ میں جانِ تازہ آئے گی'
''کہ خونِ صد ہزار انجم سے ہوتی ہے سحر پیدا''

☆

فاروقی صاحب نے حکیم الامت علامہ اقبالؒ کی سیرت وسوانح، افکار ونظریات اور دعوت وپیغام پر جو کتابیں لکھیں، ان کی تفصیل کچھ یوں ہے:

(۱) سیرتِ اقبالؒ: تفصیل پچھلے صفحات میں آچکی ہے۔

(۲) اقبالؒ اور محبتِ رسولؐ: علامہ اقبالؒ کے جشن صد سالہ کے موقع پر نومبر ۱۹۷۷ء میں ادارہ ثقافتِ اسلامیہ کلب روڈ لاہور کی طرف سے شائع ہوئی۔

(۳) افکارِ اقبالؒ: تفصیل معلوم نہیں ہوسکی۔

(۴) خیابانِ اقبالؒ: اس کی تفصیل بھی گزشتہ صفحات میں آچکی ہے۔

(۵) بزمِ اقبالؒ: تفصیل پچھلے اوراق میں دی جاچکی ہے۔

☆

حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ پر پروفیسر محمد طاہر فاروقی نے جو مضامین ومقالات لکھے، ان کی مختصر سی فہرست درج ذیل ہے:

- ''اقبالؒ کا مردِ مومن'' مطبوعہ ماہنامہ ''فنون'' لاہور شمارہ جولائی اگست ۱۹۶۶ء۔
- ''اقبالؒ کا نظریۂ فن'' مطبوعہ ماہنامہ ''ماہِ نو'' کراچی، بعدازاں مذکورہ ماہنامہ کے ''اقبالؒ نمبر'' ۱۹۷۷ء کی بھی زینت بنا۔

- ''خونِ جگر کی نمو'' مطبوعہ ماہنامہ ''ماہ نو، کراچی۔ ۱۹۷۷ء۔
- ''اقبالؔ کی شاعری'' مطبوعہ (احساس) جلد۲ شمارہ ۱۱، ۱۲۔
- اقبالؔ کا کلام، قرآن مجید کی روشنی میں (خیابان دانائے راز) ۱۹۷۷ء۔
- اقبالؔ اور پیام اقبالؔ (بزم اقبالؔ) ۱۹۶۶ء۔
- ''ہمارا اقبالؔ'' (ماہنامہ ''نونہال''، کراچی) ۱۹۷۸ء۔
- ''اقبالؔ'' (مقالہ، انقرہ یونیورسٹی، ترکی) ۱۹۶۹ء۔

غیر مطبوعہ مضامین و مقالات

(۱) ''اقبالؔ کا تصورِ فن'' (۲) ''اقبالؔ اور تصورِ موت و حیات'' (۳) ''اقبالؔ اور تصورِ قومیّت'' (۴) ''اقبالؔ اور عشقِ رسولؐ'' (۵) ''اقبالؔ خود اپنی نظر میں'' (۶) ''تلمیحاتِ اقبالؔ'' (۷) ''اقبالؔ کی شخصیت'' (۸) ''اقبالؔ کی بچوں پر شفقت'' (۹) ''ارمغانِ حجاز'' پر ایک نظر'' (۱۰) ''پیامِ مشرق'' پر ایک نظر (۱۱) ''اقبالؔ ایرانیوں کی نظر میں'' (۱۲) ''اقبالؔ کی رباعیاں اور قطعات'' (۱۳) ''اقبالؔ کا تصورِ ابلیس۔''

☆

فاروقی صاحب کی رحلت ۲۰۔ ستمبر ۱۹۷۸ مطابق ۱۶۔ شوال المکرّم ۱۳۹۸ھ بروز بدھ پشاور میں ہوئی اور دوسرے دن نشتر آباد پشاور کے قبرستان میں آخری آرام گاہ بنی۔ چند ایک مداحوں اور عقیدتمندوں نے ''قطعات تاریخ وصال'' کہے۔ بخوفِ طوالت صرف رعناؔ اکبر آبادی ثم کراچوی کا قطعہ درج ذیل ہے:۔

دورِ قحط الرجال ہے جس میں　　ہوگیا ختم عالمِ طاہرؔ
دیدہ ور، خوش نظر، شگفتہ مزاج　　کیسے کیسے تھے ہمدمِ طاہرؔ
محفلِ علم ہوگئی ویراں!!　　رہ گیا صرف ماتمِ طاہرؔ
بڑھ کے رضواں نے خود کیا ہوگا　　خلد میں خیر مقدمِ طاہرؔ
برسرِ آہ تم بھی اے رعناؔ

لکھو، ''دل میں جدا غم طاہرؔ''

۱x۱۳۹۷=۱۳۹۸ھ

☆

ماخذ

(۱) ''فدایانِ امیر ملت'' از محمد صادق قصوری مطبوعہ برج کلاں (قصور) ۱۹۸۱ء صفحہ ۴۵ تا ۵۴۔

(۲) ''تذکرہ شعرائے جماعتیہ'' از محمد صادق قصوری مطبوعہ ' ' (') ۲۰۰۶ء صفحہ ۱۱۶ تا ۱۲۰۔

(۳) ''سیرت اقبالؔ'' از پروفیسر محمد طاہر فاروقی مطبوعہ لاہور ستمبر ۱۹۶۶ء متعدد صفحات۔

(۴) ''احوال و آثار پروفیسر محمد طاہر فاروقی'' از محمد شفیق شاہد مطبوعہ پشاور ۲۰۰۱ء متعدد صفحات۔

(۵) ''خیابان فاروقی'' (مجلہ خیابان'' شعبہ اردو پشاور یونیورسٹی کا طاہرؔ فاروقی نمبر) مرتبہ ڈاکٹر محمد شمس الدین صدیقی، ڈاکٹر سید مرتضیٰ جعفری مطبوعہ ۱۹۸۰ء متعدد صفحات۔

(۶) ''رجالِ اقبالؔ'' از عبدالرؤف عروج مطبوعہ کراچی ۱۹۸۸ء صفحہ ۳۱۸، ۳۱۹۔

(۷) ماہنامہ ''انجمن'' کراچی بابت ستمبر ۱۹۷۸ء متعدد صفحات۔

(۸) مکتوب گرامی جناب پروفیسر محمد اطہر فاروقی (پسر حقیقی پروفیسر محمد طاہر فاروقی'') بنام محمد صادق قصوری از پشاور محررہ ۲۴۔ اکتوبر ۱۹۷۸ء۔

☆

بابو ملک غلام نبی سمبڑیالویؒ

بابو ملک غلام نبی ابن ملک محمد بخش کی ولادت نومبر ۱۸۸۲ء میں سمبڑیال ضلع سیالکوٹ کے ایک معزز ککے زئی گھرانے میں ہوئی۔ ۱۹۰۵ء میں بی اے کیا۔ اپنے علاقہ کے اولین گریجوایٹ تھے۔ ۱۹۱۴ء میں اسلامیہ ہائی سکول سمبڑیال کی بنیاد رکھی جس سے ہزاروں مسلمان فیض یاب ہوکر اعلیٰ عہدوں تک پہنچے۔ انگریزوں اور ہندوؤں نے اس سکول کو بند کرنے کے لئے بارہا سازشیں کیں مگر بابو جیؒ کے آہنی عزم وحوصلہ کے سامنے خاسرونامراد ہوئے۔

☆

۱۹۳۹ء میں آپ کی زیر سرپرستی سمبڑیال مسلم لیگ کا قیام عمل میں آیا۔ پھر سمبڑیال مسلم لیگ کے صدر کی حیثیت سے کارہائے نمایاں سرانجام دیئے۔ قائداعظمؒ سے غایت درجہ عقیدت ومحبت تھی۔ ''انجمن اسلامیہ سمبڑیال'' کے بانی اور لائف مینجر تھے۔ آپ نے اس انجمن کے تحت مسلمانوں کی ترقی، فلاح وبہبود اور بیداری کے لئے مقدور بھر کام کیا۔ طلباء کو سچا اور پکا نمازی بنانے کے لئے نماز کی کاپیاں چھپوائیں اور ''کملی والے کی فوج'' کے نام سے ایک فوج تیار کی جس کی زبانوں پر یہ الفاظ گونجتے تھے ؎

فوج آگئی کملیؐ والے دی — اس اللہؐ دے متوالے دی

☆

بابو جیؒ، حضرت امیر ملت رحمۃ اللہ علیہ کے مرید باصفا تھے۔ فنافی الشیخ کی منزل پر پہنچے ہوئے تھے۔ پیرومرشد کی زیر پرستی تحریک پاکستان میں گرانقدر خدمات انجام دیں۔

حضرت امیر ملت قدس سرہ العزیز کے ایسے محبوب مرید تھے کہ بعد از وصال بھی روحانی فیوض و برکات سے مستفید و مستفیض ہوتے رہے۔ قادیانیوں کے خلاف زندگی بھر جہاد کیا۔ عشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم تو رگ رگ میں سمایا ہوا تھا۔ تلاوتِ قرآن حکیم روزانہ کا معمول تھا۔ اخیر عمر میں گوشہ نشین اور رقیق القلب ہو گئے تھے۔

''حکیم الامت علامہ اقبالؒ سے والہانہ عقیدت تھی۔ روضۂ رسول صلی اللہ علیہ وسلم پر حاضری کے بعد تو یہ عالم ہو گیا تھا کہ دن میں کئی کئی بار کلام اقبالؒ پڑھتے اور روتے رہتے۔ حکیم الامتؒ کا بیشتر فارسی اور اردو کلام نوک زباں تھا کیونکہ ان کو عظیم عاشق رسول صلی اللہ علیہ وسلم سمجھتے تھے۔''

☆

حکیم الامت علامہ اقبالؒ نے ایک دفعہ ''دین اسلام'' کی تعریف یوں فرمائی تھی:

''موت کو بنظر حقارت دیکھنا اور خدا تعالیٰ پر یقین کامل کا نام ہی ''اسلام'' ہے۔

بابو جیؒ کا ایمان بھی اسی احاطہ تعریف میں آتا ہے اور یہ بات ان کی زندگی کے شب و روز سے ظاہر ہے۔ انہوں نے کسی بھی جائز معاملہ میں مصلحت کیشی سے کام نہ لیا، کیونکہ وہ تو سوز و تڑپ اور سراپا عشق تھے۔

☆

حضرت بابو جیؒ کی وفات حسرت آیات یکم۔ جنوری ۱۹۸۳ء بروز اتوار بعمر شریف ایک سو ایک سال ہوئی اور سمبڑیال میں ہی آسودۂ خاک ہوئے۔

.... ماخذ ....

(۱) ''شیدایان امیر ملت'' از محمد صادق قصوری مطبوعہ بُرج کلاں (قصور) ۱۹۹۸ء صفحہ ۵۴ تا ۶۴۔
(۲) ''تحریک پاکستان میں سیال کوٹ کا کردار'' از خواجہ محمد طفیل مطبوعہ سیال کوٹ ۱۹۸۷ء صفحہ ۴۸، ۱۶۱۔
(۳) کتابچہ ''تقریب افتتاح بابو ملک غلام نبی بی اے روڈ'' مرتبہ سرفراز حسین ملک مطبوعہ ۱۹۸۳ء مطبوعہ سمبڑیال ضلع سیال کوٹ۔
(۴) کالج نامہ گورنمنٹ اسلامیہ کالج سمبڑیال ضلع سیالکوٹ اگست ۱۹۸۶ء۔

☆

شیخ عبدالشکور لاہوریؒ

شیخ عبدالشکور بن شیخ عبدالغفور کی ولادت ۱۸۹۶ء بلھے شاہؒ کی نگری، شہر قصور میں ہوئی۔ اسلامیہ کالج لاہور سے ایف اے کرنے کے بعد شارٹ ہینڈ سیکھی اور اپنے خالو دیوان سر عبدالحمید چیف منسٹر مہاراجہ کپورتھلہ (مشرقی پنجاب، بھارت) کے پاس چلے گئے اور مہاراجہ کے سٹینو مقرر ہو گئے۔ چار سال بعد لاہور سیکرٹریٹ میں بطور اسسٹنٹ ملازم ہوئے اور ۱۹۵۲ء بطور سپرنٹنڈنٹ ریٹائرمنٹ ہوئی۔

☆

۱۹۰۸ء میں حضرت امیر ملت رحمۃ اللہ علیہ کے دستِ اقدس پر بیعت کی۔ فنافی الشیخ تھے۔ علم وادب سے گہری دلچسپی تھی۔ حافظؔ، غالبؔ اور امیرؔ مینائی کے ہزاروں اشعار زبانی یاد تھے۔ لاہور کی مجلسوں اور محفلوں کے روح رواں تھے۔ بڑے بڑے شاعر آپ کے ہاں سجنے والی شعر وادب کی محفلوں میں شرکت کرتے تھے۔ جگرؔ مرادآبادی، شوکتؔ تھانوی، نظرؔ امروہوی، رازؔ مرادآبادی، صوفی غلام مصطفےٰ تبسمؔ، سیف الدین سیفؔ، شورشؔ کاشمیری اور کتنے ہی دوسرے معروف شعراء، ادباء ان کے حضور ہو کر علم وادب کے موتی رولتے تھے۔

☆

علم وادب میں ان کے چار خلفاء تھے!

(۱) پروفیسر محمد منور مرزا (مرحوم) گورنمنٹ کالج لاہور دخلیفہء اوّل

(۲) پروفیسر بشیر الرحمٰن ملک (مرحوم) گورنمنٹ کالج لاہور خلیفہ دوم

(۳) پروفیسر مشرف انصاری (مرحوم) گورنمنٹ کالج لاہور...... خلیفہ سوم

(۴) پروفیسر مشکور حسین یاد گورنمنٹ کالج لاہور...... خلیفۂ چہارم

یہ سب لوگ اپنے دور میں علمی و ادبی دنیا میں نامور تھے۔

☆

حضرت شیخ نے ''سبزۂ بیگانہ'' کے نام سے ایک کتاب بھی لکھی جو ان کے منتخب مضامین پر مشتمل ہے۔ آپ کی وفات یکم جون ۱۹۸۵ء بروز ہفتہ سات بجے شام ہوئی اور قبرستان میانی صاحب لاہور میں آسودۂ خاک ہوئے۔

☆

حضرت علامہ اقبالؒ کے ساتھ حضرت شیخ کا جو تعلق تھا وہ ان کے درج ذیل مضمون سے ظاہر ہے جو ان کی کتاب ''سبزۂ بیگانہ'' کی زینت ہے:

''حضرت علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ''

یہ ناچیز بندہ نہ تو کوئی شاعر ہے اور نہ ادیب۔ حق بات یوں ہے کہ ہمیں تو علامہ مرحوم کے ملازم علی بخش مرحوم سے بھی گفتگو کرنے کا پورا شعور نہ تھا۔ زندگی کا بیشتر حصہ گورنر کے سیکرٹریٹ کی ملازمت میں گزار دیا۔ علامہ موصوف کے متعلق کچھ لکھنا بڑی جسارت اور کاوش چاہتا ہے۔ پھر ہماری ہستی کیا؟ البتہ جو چند واقعات میری آنکھوں کے سامنے گزرے ہیں، انہیں قلمبند کر کے پیش کرتا ہوں۔

علامہ مرحوم کو ہم نے آج سے ساٹھ سال پیشتر ''انجمن حمایت اسلام'' کے سالانہ جلسے میں پہلی مرتبہ دیکھا جبکہ وہ اپنی مشہور نظم ''شمع و شاعر'' سنانے کے لئے اسلامیہ کالج میں تشریف لائے تھے۔ علامہ کی بھرپور جوانی کا زمانہ تھا۔ سرخ سفید رنگ، شاندار مونچھیں، بڑے وجیہہ اور جامہ زیب انسان تھے۔ ترکی ٹوپی ان کے سر پر عجب بہار دکھائی تھی۔ اس سے پیشتر وہ ''انجمن حمایت اسلام'' کے سابقہ جلسوں میں اپنی ''نالہ یتیم'' جیسی مؤثر نظمیں سنا کر اپنی شاعرانہ قابلیت کی دھاک بٹھا چکے تھے۔ لہٰذا اس جلسے میں خلقت کا بے پناہ ہجوم ہو گیا تھا۔ ہندوستان کے چیدہ علماء اور مقررین وہاں جمع تھے۔ مولانا قاری شاہ محمد سلیمان

(پھلواری شریف) اور خواجہ حسن نظامی کو ہم نے پہلے وہیں دیکھا۔ آنریبل جسٹس شاہ دین ہمایوں، سرمیاں محمد شفیع اور دیگر مسلم اکابرین کے علاوہ خواجہ عبدالصمد صاحب ککڑو رئیس بارہ مولا (کشمیر) بھی وہاں تشریف فرماتھے۔ خواجہ صاحب موصوف کشمیر کے ایک بڑے تاجر تھے اور قومی کاموں میں بھرپور حصہ لیا کرتے تھے۔ وہ علامہ اقبالؔ کے فدائیوں میں سے تھے۔

چونکہ نظم ''شمع و شاعر'' کافی طویل تھی، اس لئے علامہ نے اسے دو نشستوں میں پڑھا۔ پہلی نشست نماز عصر کے بعد ہوئی اور اس کے صدر خان بہادر مرزا سلطان احمد صاحب تھے، یہ صاحب مرزا غلام احمد قادیانی کے بڑے صاحبزادے، بلا کے ذہین اور بڑے پایہ کے ادیب تھے۔ قادیانی عقائد سے مبرا تھے ان کے مضامین رسالہ ''مخزن'' کی زینت ہوا کرتے تھے۔ ان کی کتاب ''اساس الاخلاق'' کسی زمانے میں یونیورسٹی کے اعلیٰ درجوں میں شامل نصاب تھی۔

علامہ کی یہ نظم ایک پولیٹیکل شاہکار تھی اور ادبی لحاظ سے نہایت بلند پایہ۔ علامہ اسے ترنم سے سنا رہے تھے اور چندے کی ریل پیل ہو رہی تھی۔ علامہ نے جب یہ شعر پڑھا:

درغمِ دیگر بسوز و دیگراں راہم بسوز
گفتمت روشن حدیثے گر توانی دار گوش

تو خواجہ عبدالصمد ککڑو نے کہا: اقبالؔ: بارِ دگر بخواں''۔ اس پر علامہ نے بے ساختہ کہا: ''تابِ دگر بار سوختن ندارم۔'' اس برجستہ جواب پر سامعین سراپا داد بن گئے اور خواجہ صاحب نے بے تاب ہو کر علامہ کا ماتھا چوم لیا اور انجمن کو ایک ہزار روپیہ چندہ عطا فرمایا (آج کے حساب سے یہ رقم چالیس پچاس ہزار سے بھی زیادہ ہے)۔

نمازِ مغرب کے بعد دوسری نشست ہوئی تو اس کے صدر عزت نشان فقیر افتخار الدین صاحب تھے۔ فقیر صاحب موصوف سر مراتب علی شاہ کے خسر اور فقیر سراج الدین ریونیو سیکرٹری کے والد ماجد تھے اور بڑی شاندار شخصیت کے مالک۔ سفیر کابل رہ چکے تھے اور داد و دہش کے باعث مشہور تھے۔ اس اجلاس میں علامہ نے اپنی نظم پڑھنے سے پیشتر فارسی کے

چند شعروں میں ایک لطیفہ بیان کیا۔ علامہ کے ایک بے ریا دوست نے بڑے اخلاص سے ان سے کہا کہ تم ابھی تک دوئی ہی کے چکر میں پھنسے ہوئے ہو، یعنی کبھی سلطان (مرزا سلطان احمد) اور کبھی فقیر (فقیر افتخار الدین) کے پاس بیٹھتے ہو۔ یہ کیا بات ہوئی؟ اس پر علامہ نے اس کو جواب دیا کہ تم طلسم ظاہری کے اسیر ہو۔ ورنہ:

من کہ شمعِ عشق را در بزمِ دل افروختم
سوختم خود را و سامانِ دوئی ہم سوختم

اس پر سامعین نے بے اختیار داد دی اور قطعہ کو مکرر سنانے کی فرمائش کی! اب سامعین کی طرف سے اصرار ہوا کہ نظم کو فروخت ہونا چاہئے۔ خلقت کے شوق کی یہ کیفیت تھی کہ ایک ایک کاپی پانچ پانچ روپے میں فروخت ہوئی۔ اور فوراً تمام کاپیاں ختم ہوگئیں۔ اسی طرح علامہ کی شہرۂ آفاق نظمیں ''شکوہ'' اور ''جوابِ شکوہ'' تھیں جن کی بدولت انجمن کو ہزاروں روپے وصول ہو گئے۔

لاہور میں قزلباشوں کا خاندان ایک خاص مقام رکھتا ہے۔ نواب علی رضا خاں اور نواب سرنوازش علی خاں صاحب کے نام رہتی دنیا تک قائم رہیں گے۔ نواب فتح علی خاں مرحوم (والد نواب مظفر علی خاں قزلباش) ایسے شاندار انسان تھے کہ ہر تعلیمی اور قومی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ اور پھر نواب محمد علی خان قزلباش تو بڑے سخی اور خدمت گزارِ خلق تھے۔ ان کا دسترخوان بہت وسیع تھا۔ اسی لئے خلقت ان کی گرویدہ تھی۔ ان کے ہاں (۱۹۱۳ء) میں ایک بزرگ علامہ شیخ عبدالعلی صاحب ہروی رہا کرتے تھے۔ بلا کے مقرر اور سیاستدان تھے۔ وہ کبھی ایرانی پارلیمنٹ کے ممبر تھے۔ چونکہ ایران میں روسی اثر بہت تیزی سے نفوذ کر رہا تھا اور سرکار شیخ اس کے خلاف تھے لہٰذا حالات نامساعد ہونے کے باعث وہ ایران سے ہندوستان تشریف لے آئے اور نواب محمد علی خاں کے گھر مقیم ہوگئے تھے۔ اس زمانے میں علامہ انارکلی میں شیخ عنایت اللہ کی دکان کے عین سامنے، نیو مارکیٹ کی اوپر والی منزل میں رہا کرتے تھے۔ سرکار شیخ صاحب، علامہ سے ملنے کے لئے وہاں آیا کرتے تھے اور

پھر علامہ بھی مہینے میں کئی بار سرکار شیخ سے تبادلہٗ خیالات کرنے کیے لئے نواب صاحب کی کوٹھی پر آیا کرتے تھے۔

یہ خاکسار اس وقت رنگ محل سکول میں پڑھا کرتا تھا اور نواب صاحب موصوف کے دو بیٹے میرے ہم جماعت تھے۔ ان سے ہماری گاڑھی چھنتی تھی۔ ان کی کوٹھی پر میرا پھیرا اکثر رہتا تھا۔ جب کبھی علامہ مرحوم کوٹھی تشریف لاتے تو کوٹھی میں ایک عجیب بہار آجایا کرتی تھی۔ ہم سب لڑکوں سے بہت مشفقانہ انداز سے ملتے اور پرسش احوال کے بعد سرکار شیخ صاحب کے کمرے کی طرف چلے جاتے، پھر گھنٹوں تبادلہٗ خیال میں مشغول رہا کرتے تھے۔

سرکار شیخ صاحب سب کے ساتھ دستر خوان پر کھانا کھایا کرتے تھے۔ ایک دفعہ علامہ صاحب سے جو کسی بات پر بحث چھڑی تو انہیں کھانے کا بھی دھیان نہ رہا اور ادھر ہم کھانے کے لئے بے چین تھے۔ آغا سعادت نے مجھ سے کہا کہ شیخ صاحب! ذرا دیکھئے تو وہاں کیا ہو رہا ہے اور قبلہ ہروی صاحب سے کہئے کہ ہم لوگ کھانے پر ان کے منتظر ہیں۔ اب میں نے ڈرتے ڈرتے کواڑ کھولا تو دیکھا کہ وہاں گرماگرمی ہو رہی ہے اور سرکار شیخ بہ شدومد علامہ کو کوئی نکتہ سمجھا رہے ہیں۔ یہ منظر دیکھ کر میں تو بھاگ آیا اور سب سے کیفیت بیان کی۔ مگر خیر پھر چند منٹوں کے بعد سرکار شیخ صاحب تشریف لے آئے۔ علامہ تشریف لے جا چکے تھے اور ہم کھانے میں مشغول ہو گئے۔

سرکار شیخ صاحب گوناگوں خوبیوں کے انسان تھے۔ بڑے نستعلیق اور دھیمے مزاج کے بزرگ تھے۔ ہم سب سے حلیمانہ انداز سے گفتگو کیا کرتے تھے۔ طبیعت میں مزاح بھی تھا۔ چونکہ میری طبیعت میں قدرے بے تکلفی ہے اس لئے میں نے جرأت کر کے پوچھ ہی لیا۔ سرکار! بے ادبی معاف! آج ڈاکٹر اقبالؔ سے کیا بات ہو رہی تھی؟ اس پر سرکار شیخ نے ایک منٹ سکوت کیا اور پھر فرمایا:

"ذکرِ حافظ شیراز بود۔ اقبالؔ عجب مردِ بے باک است ولے ہر چہ میگوئد، راست میگوئد۔"

چونکہ اس وقت ہم لوگ محض طالب علم تھے اور فلسفے اور تصوف سے ناآشنا تھے، اس لیے ہم خاموش ہو رہے اور بات رفت گذشت ہوگئی۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد مثنوی ''اسرارِ خودی'' چھپ کر مارکیٹ میں آئی تو پتہ چلا کہ خواجہ حافظ شیراز پر کچھ گرم اشعار ہوگئے ہیں۔ یعنی:

بے نیاز از محفلِ حافظ گذر

الحذر از گو سفنداں الحذر

ان شعروں پر ہندوستان بھر میں تہلکہ مچ گیا اور صوفیہ کی مجالس میں صفِ ماتم بچھ گئی۔ علامہ پر خوب لے دے ہوئی۔ حتیٰ کہ ایک مولوی صاحب نے ان کے خلاف کفر کا فتویٰ دے دیا۔ یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ مثنوی کے پہلے ایڈیشن میں تو وہ تقریباً چالیس شعر چھپ گئے تھے لیکن بعد کے ایڈیشنوں میں یہ حصہ حذف کر دیا گیا۔

''اسرارِ خودی'' اور ''رموز بیخودی'' کے متعلق علامہ نے ایک دفعہ فرمایا تھا:

''وسط ایشیا کے قلب پر ایک پپڑی جمی ہوتی ہے، میں اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینا چاہتا ہوں۔''

علامہ ایک ہیرے کی مانند تھے۔ یعنی ان کی قابلیت کے کئی روشن پہلو تھے۔ بیرسٹری کے ساتھ ساتھ تصنیف اور شعر گوئی تو ہوتی رہتی تھی۔ لیکن ان کی طبیعت کے یہ رنگ بھی ملاحظہ ہوں کہ اگر صبح کو جرمن سفیر سے جرمن زبان میں فلسفہ اور نطشے کے عقائد پر بحث کر رہے ہیں تو دوپہر کے کھانے پر سردار صلاح الدین سلجوقی سفیر کابل سے حافظ شیراز اور مولانا روم کے متعلق گفتگو ہو رہی ہے۔ پھر شام کو کبھی کبھی پنجابی زبان کے بے مثل شاعر میاں عشق لہر آ جاتے تو ان سے کمال شوق سے خیال اور نعتیں سن رہے ہیں۔ ان کے دل کی نزاکت کی یہ کیفیت تھی کہ حضرت رسول مقبول صلی اللہ علیہ وسلم کا نام نعت میں آ جاتا تو بے اختیار رونے لگتے اور ہچکی بندھ جایا کرتی تھی۔ خصوصاً جب (راقب قصوری کی) یہ نعت پڑھی جاتی تو عجیب

کیفیت ہونے لگتی اور ان کو سنبھالنا مشکل ہوتا تھا:

جے دل نیڑے تے روضہ دُور کیہہ اے

نی خبرے اوس نوں منظور کیہہ اے

اب ذرا علامہ کے روحانی مقام کے متعلق جو واقعہ مولانا عبدالمجید سالک نے قلمبند کیا ہے سنیئے:

''ایف سی کالج (لاہور) کے پرنسپل ڈاکٹر لوکس نے ایک ملاقات میں حضرت اقبالؔ سے سوال کیا کہ کیا آپ کے نبی (صلی اللہ علیہ وسلم) پر قرآن کا مفہوم نازل ہوتا تھا، جسے وہ اپنے الفاظ میں بیان کرتے تھے یا الفاظ نازل ہوتے تھے؟ جواب دیا کہ میرے نزدیک قرآن کی عبارت عربی زبان میں آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) پر نازل ہوئی تھی۔ یعنی قرآن کے مطالب ہی نہیں بلکہ الفاظ بھی الہام ہیں۔ اس پر ڈاکٹر لوکس نے کہا، مجھے بڑی حیرت ہوتی ہے کہ آپ ایسا عالی دماغ فلسفی الہامِ لفظی پر کیونکہ اعتقاد رکھتا ہے۔''

فرمایا:

''میں اس معاملے میں کسی دلیل کا محتاج نہیں ہوں۔ مجھے تو خود اس کا تجربہ حاصل ہے۔ میں پیغمبر نہیں ہوں، محض شاعر ہوں۔ جب مجھ پر شعر کہنے کی کیفیت طاری ہوتی ہے تو مجھ پر بنے بنائے اور ڈھلے ڈھلائے شعر اترنے لگتے ہیں اور میں انہیں بعینہٖ نقل کر لیتا ہوں۔ بارہا ایسا ہوا ہے کہ میں نے ان اشعار میں کوئی ترمیم کرنا چاہی، لیکن میری ترمیم اصل اور ابتدائی نازل شدہ شعر کے مقابلے میں بالکل ہیچ نظر آئی۔ اور میں نے شعر کو جوں کا توں رکھا۔ جس

حالت میں ایک شاعر پر پورا شعر نازل ہوسکتا ہے تو اس میں کیا
مقام تعجب ہے کہ آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) پر قرآن کی پوری
عبارت نازل ہوئی تھی۔''

ولایت سے بیرسٹری کا امتحان پاس کرنے کے بعد لاہور آکر کچھ عرصہ تو بھاٹی دروازہ کے اندر ایک مکان میں مقیم رہے اور پھر وہ انارکلی کے اس مکان میں اٹھ آئے جو شیخ عنایت اللہ کی دکان کے عین سامنے ہے اور جو اس وقت ''راجہ برادرز'' کی دکان تھی اور اب وہاں نیو مارکیٹ ہے۔ علامہ مرحوم اس زمانے میں لاہور ہائیکورٹ میں پریکٹس کیا کرتے تھے۔ شیخ عنایت اللہ کی دکان سے چار پانچ دکانیں ادھر ہمارے ایک شفیق دوست شیخ عبداللطیف ڈنٹسٹ کی دکان تھی۔ یہ صاحب بڑے ہنس مکھ اور یار باش قسم کے انسان تھے اور دوستوں پر جان چھڑکتے تھے۔ ان کی دکان پر بعد دوپہر دوستوں کا جمگھٹا رہتا تھا۔ اور موسم کے مطابق شربت اور چائے کا انتظام بڑے خلوص سے کیا کرتے تھے۔

یہ خاکسار ۱۹۲۱ء کے اوائل میں ریاست کپورتھلہ (حال مشرقی پنجاب، بھارت) کی ملازمت چھوڑ کر پنجاب سیکرٹریٹ میں بطور اسسٹنٹ ملازم ہوگیا تھا۔ اور دفتر سے واپسی پر شیخ عبداللطیف صاحب کی دکان پر بالعموم پہنچ جایا کرتا تھا۔ سر عبدالقادر کے داماد شیخ عبداللطیف تپش بھی (جو ان دنوں پنجاب اسمبلی میں ملازم تھے) وہاں تشریف لایا کرتے تھے۔ شیخ عبدالاحد (مرحوم) سپرنٹنڈنٹ پولیس بھی وہاں آن پہنچتے۔ دوستوں کی ''پالی جمتی'' اور خوب لطیفہ بازی ہوا کرتی۔ ایک دن کا ذکر ہے کہ ہم سب دوست حسبِ معمول لطیفہ گوئی میں مصروف تھے کہ تپش صاحب نے ایسا شعر پڑھا کہ ہم سراپا داد بن گئے۔ ملاحظہ ہو:

گر نہ سر پائے شود راہِ تو رفتن نتواں
جز بہ جا روبِ مژہ کوئے تو رفتن نتواں
(فیضی)

اسی اثناء میں اتفاق سے علامہؒ کے منشی شیخ طاہر دین صاحب ادھر آنکلے۔ شیخ صاحب

موصوف کی ذاتِ گرامی بھی مغتنمات میں سے تھی۔ خلوص اور شفقت کے پتلے تھے۔ شیخ صاحب نے جب ہمیں واہ واہ کرتے اور داد دیتے دیکھا تو دکان کے سامنے رک گئے اور دریافت فرمایا کہ کس شعر پر داد مل رہی ہے۔ اس پر تپش صاحب نے انہیں وہ شعر سنایا۔ دراصل شعر ہی ایسا تھا کہ شیخ صاحب نے بھی بے ساختہ داد دی اور دوسرے مصرع کو دو تین بار دہرایا۔ دو منٹ سکوت کے بعد شیخ صاحب (طاہر دین) نے فرمایا۔ لیجئے ایک شعر سنیے:

سر بر سرِ راہِ تو فدا شد چہ بجا شد
ایں بارِ گراں بود ادا شد چہ بجا شد
(عرفی)

ظاہر ہے کہ یہ شعر بھی بہت خوب تھا اور ہم نے خوب داد دی اور شیخ صاحب کے ذوقِ سلیم کی تعریف کرتے رہے۔

اب مجھے معاً جناب علامہ اقبال کا خیال آیا۔ اور میں نے شیخ صاحب موصوف سے دریافت کیا، کہئے جناب! ڈاکٹر صاحب کا کیا حال ہے اور پریکٹس کیسے چل رہی ہے (اس زمانے میں لوگ انہیں ڈاکٹر اقبال ہی کہا کرتے تھے)۔ شیخ طاہر دین صاحب نے جواب دیا کہ ڈاکٹر صاحب بالکل بخیریت ہیں، البتہ پریکٹس کے متعلق کوئی جواب نہ دیا۔ بلکہ مجھے دکان سے باہر آنے کو کہا۔ ان کے ارشاد کے مطابق میں دکان سے باہر نکل کر بازار میں کھڑا ہو گیا۔ اب شیخ صاحب نے مجھے علامہ کے مکان کے کٹہرے کی طرف دیکھنے کو کہا۔ چنانچہ میں نے دیکھا:

دو شخص کمبل اوڑھے آمنے سامنے بیٹھے ہیں۔ پھر شیخ طاہر دین فرمانے لگے: شکور صاحب! وہ ایک تو آپ کے ڈاکٹر اقبال ہیں اور دوسرے گرامی صاحب ہیں۔ یہ دونوں حضرات تین دن سے یہاں براجمان ہیں، یہیں کھانا کھاتے ہیں اور پھر نیند آتے ہی یہیں لیٹ بھی رہتے ہیں۔ اگر ڈاکٹر اقبال کوئی شعر پڑھتے ہیں تو گرامی صاحب سر ہلانے لگتے اور اگر گرامی صاحب کوئی شعر پڑھتے ہیں تو ڈاکٹر صاحب سر ہلانے لگتے ہیں۔ ایسے میں بھلا کیا

خاک پریکٹس چلے گی؟

ہم سر ہلنے والے فقروں پر بہت ہنسے۔ مگر حقیقت یہی ہے کہ ان کا یہ فقرہ درست تھا۔ کیونکہ جب کچھ عرصے بعد ''پیامِ مشرق'' چھپ کر منصہ شہود پر آئی تو ہماری سمجھ میں یہ بات آئی کہ یہ حضرات کیوں ایک جگہ تین تین دن بیٹھے رہتے تھے۔ جی ہاں! کچھ ایسے ہی تو شعر ہوں گے کہ گرامی صاحب جیسے بے بدل شاعر بھی سر ہلاتے ہوں گے۔ ذرا آپ بھی سنیں:

آشنا ہر خار را از قصہ ما ساختی — در بیابانِ جنوں بُردی و رُسوا ساختی
جرمِ ما از دانہ، تقصیر او از سجدہ — نے بآں بیچارہ می سازی نہ باما ساختی
صد جہاں می روئیداز کشتِ خیالِ ماچوگل — یک جہان وآں ہم از خونِ تمنا ساختی

علامہ مرحوم کی آخری علالت کافی طویل تھی۔ ۱۹۳۷ء میں عید کا تہوار جنوری میں ہوا۔ علامہ صاحب عید کی نماز شاہی مسجد میں پڑھا کرتے تھے۔ آپ جراب پہنے بغیر، سرد فرش پر سے گزرتے ہوئے منبر کے قریب پہنچ گئے۔ نماز کے بعد واپسی پر اسی طرح فرش پر سے گزرے۔ گھر پہنچ کر شیر خرما کھالیا (شاید دہی ملا کر) اس سے انہیں سانس کی تکلیف ہوگئی اور پھر آواز تقریباً بند ہوگئی۔ مختلف علاج کئے گئے، تھوڑے عرصہ کیلئے تو آرام آجاتا تھا، مگر تکلیف پھر عود کر آتی تھی۔ آخر دہلی کے مشہور طبیب، حکیم نابینا صاحب کی طرف رجوع کیا گیا اور سیّد نذیر نیازی صاحب (جو اس وقت جامعہ ملیہ دہلی میں پڑھا کرتے تھے) حکیم صاحب موصوف سے مشورہ کر کے ادویات بھجواتے رہتے۔ اور اس طرح خط و کتابت سے علاج ہوتا رہا۔ اس علاج سے بہت کچھ افاقہ ہوا۔ لیکن کچھ مدت کے بعد پھر آواز میں کمی ہوگئی۔ اور سب سے بڑا اندوہ یہ تھا کہ علامہ صاحب کی بینائی زائل ہوگئی تھی۔

میرے ہم زلف شیخ محمد سرور انسپکٹر ریلوے (لکھنؤ) اسی بیماری میں مبتلا تھے۔ اتفاق حسنہ سے لاہور کے مشہور ڈاکٹر کرنل پوری لکھنؤ میڈیکل کالج کے طالب علموں کا امتحان لینے کے سلسلے میں وہاں کے سول ہسپتال میں گئے۔ اور وہاں انہوں نے شیخ سرور کو اس عجیب

بیماری میں مبتلا دیکھا۔ کرنل صاحب نے شیخ سرور صاحب کو مشورہ دیا کہ اس مرض کے لئے اپریشن ضروری ہے اور ہندوستان میں فقط ایک کرنل میراجکر ہی کر سکتے ہیں، جو اس وقت لاہور کے میو ہسپتال میں سرجن تھے۔ کرنل پوری کی رائے پر عمل کیا گیا اور سرور صاحب کو لاہور لایا گیا۔ پھر کرنل میراجکر نے نہایت تندہی سے ان کے گلے کی رگوں کا اپریشن کیا اور یہ عمل چھ گھنٹے تک جاری رہا۔ ہندوستان بھر میں ایسا اپریشن فقط دوسرا تھا جو کامیاب رہا۔ اس اپریشن کی شہرت دور دور تک پھیل گئی۔ کسی نہ کسی طرح اس اپریشن کی خبر جناب علامہ تک بھی پہنچ گئی۔ چنانچہ حالت دریافت کرنے کے لئے اس خاکسار کو طلب کیا گیا۔ شیخ طاہر دین مجھے سیکرٹریٹ سے اپنے ہاں لائے اور علامہ کے کمرے میں لے گئے۔ اس وقت ان کے بہت سے فدائی مثلاً راجہ حسن اختر، خواجہ عبدالرحیم اور ڈاکٹر عبدالحمید صاحب وہاں تشریف فرما تھے اور مصروفِ گفتگو تھے۔ علامہ اسی پرانے پلنگ پر لیٹے ہوئے تھے اور جسم کے گرد وہی پرانا کمبل لپیٹ رکھا تھا جو ان کا ہمدمِ دیرینہ تھا۔

علامہ اس قدر نحیف ہو چکے تھے کہ میں دیکھ کر ہکا بکا رہ گیا مگر خاموش رہا۔ اب شیخ طاہر دین نے سب حضرات کو باہر تشریف لے جانے کو کہا۔ چنانچہ جب کمرہ خالی ہو گیا تو جناب پلنگ پر اٹھ کر بیٹھ گئے۔ اور مجھ سے خیریت دریافت کرنے کے بعد میرے عزیز کے مرض اور اپریشن کے متعلق پوچھا۔ میں نے مختصراً دونوں کی کیفیت بیان کی، علامہ غور سے سنتے رہے۔ میری ناقص رائے میں اگرچہ علامہ مرحوم کا مرض بھی قریب قریب وہی تھا جو میرے عزیز کا تھا، مگر میں نے ان کی تسلیٔ خاطر کے لئے کہا:

> ''جناب آپ کا مرض وہ ہرگز نہیں جو میرے عزیز کو لاحق تھا اور جس کے لئے اپریشن کی ضرورت پڑی۔ حضور کا مرض تو مختلف ہے، اور امید ہے کہ قبلہ حکیم قرشی صاحب کے علاج سے انشاء اللہ جلد آرام ہو جائے گا۔''

میری بات ختم ہونے پر علامہ مرحوم نے جو فقرے کہے وہ یادگار ہیں۔ فرمانے لگے:

''شیخ صاحب! آپ ہمیں کیا تسلی دیتے ہیں، ہم بہت زندگی دیکھ چکے ہیں اور موت سے کوئی ڈر نہیں۔ دعا کریں کہ ہماری عاقبت پاک ہو۔''

یہ ایسے فقرے تھے کہ میرے آنسو بے اختیار نکل پڑے۔ واقعی خاصانِ خداؒ کا شیوہ یہی ہے، ''چوں مرگ آید تبسم برلبِ اوست''! ازاں بعد علامہ کی حالت روز بروز بگڑتی چلی گئی اور آخر ۲۱۔ اپریل ۱۹۳۸ء کو عالمِ اسلامی کا وہ چراغ جس سے لوگ نور حاصل کرتے تھے ہمیشہ کے لئے بجھ گیا۔ آج سے چالیس سال پیشتر ایک مشہور ہندو مصنف لالہ مالک رام ایم اے نے علامہ مرحوم کے متعلق جو شذرہ تحریر کیا تھا، وہ بھی سننے کے قابل ہے:

''اقبالؔ کی شاعری اب یاس و قنوط کی زنجیروں سے آزاد ہوگئی ہے۔ اُس نے اس میں خود اعتمادی کا جذبہ پیدا کر دیا ہے۔ اور نئی عمارت کو متفاولی بنیادوں پر قائم کیا ہے۔ اس کا نام ''وعدہ'' اور ''بشارت'' کا مترادف ہے۔ اس نے زمانۂ حاضر کے غیر معمولی اثر پر قابو پالیا ہے جو فضائے ہند پر چھایا جا رہا تھا، اور یہ سب کچھ اس نے اخلاقی قوت کی مدد سے کیا ہے۔ جس کا منبع اور مبداء خالص اسلامی ہے۔ اس کی روحانی تعلیم نے اس انانیت کو فتح کر لیا ہے جو اس مادی دور کی پیداوار ہے۔ اقبالؔ اسلامی کاروان کا سالار ہے جس کی منزل مقصود حرم محترم ہے!''

☆

.... ماخذ ....

(۱) ''شیدایانِ امیر ملت'' از محمد صادق قصوری مطبوعہ بُرج کلاں (قصور) ۱۹۸۸ء

(۲) ''سبزۂ بیگانہ'' از شیخ عبدالشکور مطبوعہ، کراچی ۱۹۸۰ء۔

☆

حاجی سر سیٹھ محمد اسمٰعیل بنگلوریؒ

حاجی سر سیٹھ محمد اسمٰعیل بنگلور، ریاست میسور (حال بھارت) کے رہنے والے تھے۔ بہت بڑے رئیس، بین الاقوامی تاجر اور صاحبِ اثر و رسوخ تھے۔ بنگلور کا مشہور زنانہ ہسپتال المعروف گوشہ ہسپتال ان کا بنا کردہ ہے۔ کئی مساجد تعمیر کرائیں اور لاکھوں روپے مسلمانوں کی تعلیم پر خرچ کرتے تھے۔ مسلمانوں کے محسن کی حیثیت سے پورے ہندوستان میں ان کا شہرہ تھا۔ مذہبی، ملی، علمی، ادبی اور رفاعی کاموں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ عالم اسلام کے معروف شیخ طریقت امیر ملت حضرت پیر سیّد جماعت علی شاہ محدث علی پوری رحمۃ اللہ علیہ کے دستِ حق پرست پر بیعت تھے۔ پیر و مرشد سے والہانہ عقیدت و محبت رکھتے تھے۔

ایک دفعہ حضرت امیر ملت قدس سرہ العزیز بنگلور میں فروکش تھے کہ حاجی سر سیٹھ محمد اسمٰعیل ایک غیر مقلد (وہابی) کو ہمراہ لے کر حاضر خدمت ہوئے اور اس کو ایک انگریز ڈاکٹر جو حضرت امیر ملت علیہ الرحمہ کے ہاتھ پر اسلام قبول کر کے بیخود ہو کر تین گھنٹے تک بے ہوش پڑا رہا، کی حالت دکھا کر کہنے لگے:

''اگر تم اس کو اس وقت ہوش میں لے آؤ تو میں تمہیں ایک سو روپیہ انعام دیتا ہوں۔''

بھلا وہ کیسے اس وقت اس کو ہوش میں لا سکتا تھا۔

''یہ نشہ وہ نہیں جسے ترشی اتار دے''۔

سیٹھ صاحب موصوف نے اپنے ہمراہی سے کہا کہ

''نہایت افسوس کی بات ہے کہ تم بھنگ، دھتورہ جیسی چیزوں کی تاثیر تو مانتے ہو، مگر خداؐ کے نام میں تاثیر کو نہیں مانتے۔''

وہ بہت شرمندہ و نادم ہوا۔

حاجی سیٹھ محمد اسمٰعیل کو حکیم الامت حضرت علامہ اقبالؔ رحمۃ اللہ علیہ سے بھی عقیدت تھی کہ ان کے پیرو مرشد حضرت امیر ملتؒ اور حکیم الامتؒ کے درمیان رشتۂ اخوت و محبت بڑا مستحکم، لازوال اور بے مثال تھا۔

۱۹۲۹ء میں حکیم الامتؒ جب مدراس کے دورہ پر گئے تو سیٹھ محمد اسمٰعیل استقبال کیلئے مدراس کے ریلوے سٹیشن پر موجود تھے اور مدراس میں انہوں نے حضرت حکیم الامتؒ کو بنگلور میں اپنے ہاں ٹھہرنے کی دعوت دی تھی۔ چنانچہ ۹۔ جنوری ۱۹۲۹ء کو صبح سوا چھ بجے گاڑی بنگلور چھاؤنی کے سٹیشن پر رکی تو ہزاروں مسلمانانِ بنگلور نے حاجی سیٹھ محمد اسمٰعیل کی قیادت میں حکیم الامتؒ، کا فقید المثال استقبال کیا۔ لوگوں کے ہاتھوں میں پھولوں کے بڑے بڑے ہار جو خاصے قیمتی تھے، اسٹیشن کی فضا کو معطر کر رہے تھے۔ سٹیشن کو بڑی خوبصورتی سے سجایا گیا تھا۔ حکیم الامتؒ حاجی سیٹھ صاحب کے ساتھ ان کی موٹر کار میں سوار ہو کر ان کی رہائش گاہ ''الکس لاج'' کی طرف روانہ ہوئے۔ لوگوں نے دیوانہ وار موٹر کے ساتھ بھاگنا شروع کر دیا لہٰذا نصف میل کا راستہ طے کرنے کیلئے گاڑی کو نہایت آہستہ آہستہ چلانا پڑا۔

اس سے آگے کی تفصیل حکیم الامت علیہ الرحمہ کے فرزند ارجمند ڈاکٹر جاوید اقبالؔ کی زبانی سنئے۔ وہ لکھتے ہیں:

''دس بجے صبح مسلم لائبریری معسکر بنگلور کے زیر اہتمام اقبالؔ کے اعزاز میں مہاتما گاندھی روڈ پر واقع اپرا ہاؤس میں ایک جلسہ منعقد ہوا، جس میں حکیم الامت کو سپاس نامہ پیش کیا گیا۔ جلسے کی صدارت امین الملک سر مرزا اسمٰعیل وزیر اعظم ریاست میسور نے کی۔ اقبالؔ نے اپنی جوابی تقریر میں دنیا کے اسلامی کتب خانوں پر

روشنی ڈالی اور مسلم لائبریری کو ترقی دینے پر زور دیا۔ اس کے بعد کتب خانہ میں کتابوں کا معائنہ فرمایا اور کتاب آراء میں تحریر فرمایا:

''جنوبی ہندوستان کے مسلمان نوجوان خصوصاً بنگلور کے مسلمانوں میں اسلامی کلچر کی اشاعت کا پورا احساس پیدا ہو چکا ہے، جس کو میں تمام ہندوستان کے مسلمانوں کے لئے نیک فال تصور کرتا ہوں۔ میں سمجھتا ہوں کہ بنگلور کی مسلم لائبریری نے احساس پیدا کرنے میں بڑا حصہ لیا ہے اور میں امید کرتا ہوں کہ مستقبل قریب میں اس لائبریری کے اثر کا دائرہ اور بھی وسیع ہو جائے گا۔ اراکین کتب خانہ کو چاہئے کہ تاریخ میسور کی قلمی کتابوں کی طرف بالخصوص توجہ فرمائیں۔''

''اسی شام دوسرا جلسہ آرٹس اینڈ سائنس کالج کے میدان میں ہوا۔ یہ جلسۂ عام محکمہ تعلیم میسور کی طرف سے منعقد کیا گیا تھا جس کی صدارت پروفیسر سبا راؤ نے کی۔ اس میں بنگلور کے ہزاروں تعلیم یافتہ ہندو اور مسلمان جمع تھے۔ اس موقعہ پر اقبالؒ نے ایک پر مغز فلسفیانہ تقریر کی۔ رات کا کھانا بنگلور کے ایک اور مسلمان رئیس حجمان محمد علی کے ہاں تھا۔ جس میں ہزار ہا معززین مدعو تھے۔ دعوت کا انتظام میمن تاجروں کی روایات کے مطابق فرشی تھا۔ بنگلور میں مختصر قیام کے دوران میں اقبالؒ کی ملاقات وہاں کے بیشتر شرفاء سے ہوئی اور حاجی اسمٰعیل سیٹھ کی کوٹھی میں ملنے والوں کا ایک تانتا لگا رہا۔

۱۱۔ جنوری ۱۹۲۹ء کو قلعہ سرنگا پٹم کی سیر اور شہید سلطان ٹیپو کے مزار کی زیارت کی۔ ۱۲۔ جنوری کو میسور یونیورسٹی کا شعبہ نفسیات عملی دیکھنے گئے۔ دوبارہ ٹیپو سلطان کے مزار پر فاتحہ

پڑھی۔ شام پانچ بجے کے قریب بنگلور واپسی ہوئی۔ سر مرزا اسمٰعیل وزیر اعظم میسور کے ساتھ چائے نوش کی۔ چائے سے فارغ ہو کر سر اسمٰعیل سیٹھ کی کوٹھی پر پہنچ گئے۔ رات کا کھانا بنگلور کے کسی تاجر محمد علی کے ہاں تھا۔ تمام عمائد شہر وہاں مدعو تھے۔ رات گئے سر اسمٰعیل سیٹھ کی رہائش گاہ میں آ کر سوئے۔''

(زندہ رود، ڈاکٹر جاوید اقبال مطبوعہ لاہور ۲۰۰۴ء صفحہ ۴۲۸ تا ۴۳۲)

.... ماخذ ....

(۱) ''سیرتِ امیر ملتؒ'' سیّد اختر حسین علی پوری / پروفیسر محمد طاہر فاروقی مطبوعہ علی پور سیّداں ضلع سیال کوٹ ۱۹۷۵ء صفحہ ۶۰۶

(۲) ''زندہ رود''، ڈاکٹر جاوید اقبال، مطبوعہ لاہور ۲۰۰۴ء صفحہ ۴۲۸ تا ۴۳۲

☆

قضیہ مہاراجہ کرشن پرشاد

آنجہانی مہاراجہ کشن پرشاد شاد (ولادت ۲۸ فروری ۱۸۶۴ء وفات ۹ مئی ۱۹۴۰ء) کے بارے میں نواب مشتاق احمد خان (۲۰۰۵ء۔۱۹۰۳ء) سفیر حیدرآباد دکن برائے پاکستان اپنی کتاب ''حیات فخر'' مطبوعہ لاہور مارچ ۱۹۲۶ء کے صفحہ ۱۳۹ پر لکھتے ہیں۔

''یمین السلطنت مہاراجہ سرکشن پرشاد دربار اکبری کے نورتن کے مشہور رکن راجہ ٹوڈرمل سے اپنا نسبی تعلق رکھتے تھے۔ اُن کے مورثِ اعلیٰ راجہ چندو لال دس برس (۱۸۳۲ء۔۱۸۴۲ء) تک وزیراعلیٰ کے عہدہ پر فائز رہے۔ اُن کے نانا راجہ نریندر پرشاد اعلیٰ حضرت خلد مکانی میر محبوب علی خان کے سن بلوغت تک کونسل آف ریجنسی کے رکن تھے۔ مہاراجہ یمین السلطنت خود ۱۹۰۱ء سے ۱۹۱۲ء تک مدار المہام اور پھر ۱۹۲۵ء تک صدر اعظم رہے''۔

مشہور مورخ، ادیب اور مصنف محمد امین زبیری (۱۹۵۸ء۔۱۸۷۰ء) اپنی تصنیف ''خدوخال اقبال'' مطبوعہ کراچی ۱۹۸۶ء میں رقمطراز ہیں۔

''سرمہاراج کشن پرشاد المتخلص بہ ''شاد'' حیدرآباد دکن کے ایک بہت بڑے خاندانی جاگیردار تھے جو ہندو گھرانے میں ہندو والدین سے پیدا ہوئے اور اپنے ہندو اور کھتری ہونے کا بار بار تحریری وزبانی اعادہ بھی کرتے رہے۔ آخری وصیت نامہ میں بھی اپنے ہندو اور کھتری ہونے کا

بار بار اظہار کیا ہے۔ (لائف مہاراجہ کرشن پرشاد صفحہ ۲۸۳) قدیم تعلیم بہت اچھی تھی۔ شعر و سخن اور ادب سے ذوق تھا، مزارات پر حاضری، زیارت و منت اور فقراء و مشائخ کی دعاؤں کے بڑے معتقد تھے اور خود کو ایک صوفی کی حیثیت سے نمایاں کرتے تھے۔

حالانکہ ان کی کئی بیویاں تھیں مگر انہوں نے اپنی صوفی منشی کی نقاب ڈال کر اپنے اقتدار و دولت اور رُعب وزارتِ عظمیٰ سے جو نظام سادس میر محبوب علی خاں کے عہد میں تھا، ایک سیّد کی حسین لڑکی کو بیوی بنا لیا۔ (حاشیہ) اس واقعہ پر بہت کچھ ہیجان ہوا، مضامین بھی نکلے تھے۔ (صفحہ ۴۸، ۴۹)۔

۱۹۱۱ء میں میر عثمان علی خاں نظام سابع فرمانروا ہوئے تو کچھ عرصہ بعد شاد وزارت سے علیحدہ کر دیئے گئے۔ یہ اُن کی زندگی کا سخت سانحہ تھا۔ اب مزاروں پر منت و دعا کے لیے انہوں نے ایک دورہ کیا، ۱۹۱۳ء میں لاہور بھی آئے۔ اقبالؔ سے بھی ملاقاتیں ہوئیں، انجمن حمایت اسلام کے یتیم خانہ کا وفد بھی پیش ہوا جس کو ایک ہزار روپیہ کا عطیہ دیا گیا۔ دو ہندو رؤسا نے استقبالیہ دعوتیں بھی کیں۔ چونکہ اُن کے مذہب کی طرف سے بدگمانی تھی، اُس کو دور کرنے کے لیے ایک دعوت میں اپنے ہندو مذہب پر ہونے کا علی الاعلان اعتراف بھی کیا اور نعت لکھنے اور دیگر اسلامی امور میں دلچسپی لینے کی توجیہہ بیان کی''۔ (ص ۴۹)

''۱۹۲۷ء میں شاد یاوری قسمت سے پھر وزارتِ عظمیٰ پر فائز ہو گئے۔ ۱۹۲۹ء میں اقبالؔ بھی حیدر آباد گئے، شادؔ نے بڑی خاطر مدارت کی، نظام سے بھی ملاقات ہوئی''۔ (ص ۵۱)

اقبالؔ ۳۱۔ اکتوبر ۱۹۱۶ء کے خط میں لکھتے ہیں۔

''راجہ گوبند پرشاد مرحوم و مغفور کی خبر رحلت معلوم کر کے افسوس ہوا۔ اللہ تعالیٰ اُن کو غریق رحمت کرے''۔ (ص ۵۱)

محمد امین زبیری صفحہ ۵۱ پر ''حاشیہ'' میں لکھتے ہیں:

(راجہ گوبند پرشاد اُن کے علاقائی بھائی تھے اور خود مہاراجہ کے اطلاعی خط میں لفظ ''آنجہانی'' تھا جو مسلمانوں کے ادب میں غیر مسلم متوفی کے لیے مخصوص ہے مگر علامہ نے وہ دعائے مغفرت بھی کر دی جو محض مسلمانوں کے لیے ہے اور مشرک کے لیے جائز نہیں''۔

صفحہ ۸۱ پر ''حاشیہ'' میں زبیری صاحب مزید رقمطراز ہیں کہ:

''علامہ نے ۱۶ مئی ۱۹۱۷ء کے خط میں شاد کو لکھا کہ

''آپ کی ذات تو انسانوں کے لیے چشمہ فیض و برکات ہے۔ حالانکہ علامہ کے لیے نہ بن سکی''۔

☆

''اقبال اور حیدر آباد دکن'' کے مصنف نظر حیدر آبادی (۱۹۶۳۔۱۹۱۹ء) اپنی کتاب مطبوعہ اقبال اکادمی لاہور طبع دوم ۱۹۸۱ء صفحہ ۲۰۰ تا ۲۰۳ پر اشہب قلم کو یوں دوڑاتے ہیں:

''...... مہاراجہ کی جوہر شناسی کا مقام اُس وقت بہت بلند ہو جاتا ہے جب ہم کو جدید شعروادب کے کارواں کے سرخیل اقبالؔ بھی اُن کے زمرۂ یاراں میں نظر آتے ہیں۔ اقبالؔ سے اُن کے مراسم کی مختلف نوعیتیں ہیں۔ اقبالؔ اُن کے بعض اہم معاملات میں راز دان اور مشیر بھی ہیں اور شعروادب کے سلسلے میں رہنما اور استاد بھی۔ خود اقبالؔ کے ذہن میں مہاراجہ نے کیا اثرات چھوڑے تھے، اُس کی تصویر ہمیں اقبالؔ کی اس نظم میں نظر آتی ہے، جو اُنہوں نے مہاراجہ کو مخاطب کر کے کہی تھی۔ یہ نظم اُن کے کسی مجموعے میں شامل نہیں لیکن ''مجلّہ عثمانیہ'' کے ''مہاراجہ نمبر'' میں شائع کی گئی۔ اس کتاب کے ناظرین کے لیے یہ ایک نایاب تحفہ ہے اس لیے ہم پوری نظم یہاں نقل کرتے ہیں۔

''گزشتہ مارچ (۱۹۱۰ء) میں مجھے حیدر آباد جانے کا اتفاق ہوا اور وہاں آستانہ وزارت پر حاضر ہونے اور عالی جناب ہنر ایکسیلینسی مہاراجہ کرشن پرشاد بہادر جی۔سی۔آئی۔ای یمین السلطنت پیشکار وزیر اعظم دولتِ آصفیہ المتخلص بہ شاد کی خدمتِ بابرکت میں باریاب ہونے

کا فخر بھی حاصل ہوا۔ ہز ایکسیلنسی کی نوازش کریمانہ اور وسعتِ اخلاق نے جو نقش میرے دل پر چھوڑا، وہ میرے لوحِ دل سے کبھی نہ مٹے گا۔ مزید الطاف یہ کہ جناب ممدوح نے میری روانگیٔ حیدر آباد سے پہلے ایک نہایت تلطف آمیز خط لکھا اور اپنے کلام شیریں سے بھی شیریں کام فرمایا۔ ذیل کے اشعار اس عنایت بے غایت کے شکریہ میں دل سے زبان پر بے اختیار آ گئے۔ انہیں زبانِ قلم کی وساطت سے جناب مہاراجہ صاحب بہادر کی خدمت میں پہنچانے کی جرأت کرتا ہوں''۔

ہو رہی ہے زیرِ دامانِ افق سے آشکار
صبح، یعنی دخترِ دوشیزۂ لیل و نہار
پاچکا فرصت و رودِ فصلِ انجم سے سپہر
کشت خاور میں ہوا ہے آفتاب آئینہ کار
آسماں نے آمدِ خورشید کی پاکر خبر
محمل پروازِ شب باندھا بسر دوشِ غبار
شعلۂ خورشید گویا حاصل اس کھیتی کا ہے
بوئے تھے دہقانِ گردوں نے جو تاروں کے شرار
ہے رواں نجمِ سحر، جیسے عبادت خانے سے
سب سے پیچھے جائے کوئی عابد شب زندہ دار
کیا سماں ہے جس طرح آہستہ آہستہ کوئی
کھینچتا ہو میان کی ظلمت سے تیغ آبدار
مطلعِ خورشید میں مضمر ہے یُوں مضمونِ صبح
جیسے خلوت گاہِ مینا میں شرابِ خوشگوار
ہے تہِ دامانِ باد اختلاط انگیز صبح
شورشِ ناقوس آوازِ اذاں سے ہمکنار

جاگے کوئل کی اذاں سے طائرانِ نغمہ سنج
ہے ترنم ریز قانونِ سحر کا تار تار
گرچہ قدرت نے مجھے افسردہ دل پیدا کیا
آنکھ وہ بخشی کہ ہے نظارہ آشامِ بہار
کھینچ کر سوئے گلستاں لے گیا ذوقِ نظر
عاشقِ فطرت کو ہے صحنِ گلستاں کوئے یار
گُل نے بلبل سے کہا لے ہمصفیر آیا ترا
کہتی تھی بُلبل کہ اے مقصودِ چشمِ انتظار
اتنے دن غائب رہا تو گلشنِ پنجاب سے
کر لیا تھا کیا کسی صیاد نے تجھ کو شکار
کس سے کہتے راز لالہ ہائے شعلہ پوش
کس پہ کرتے دردِ دل اپنا عنا دل آشکار
پوچھتی تھی روز مجھ سے نرگسِ شبنم فریب
ہوگیا غائب کہاں اپنے چمن کا راز دار
پھول فرقت میں تری سوزن بہ پیراہن رہے
دیدہ قمری میں تھا صحنِ گلستاں خار خار
غنچہ نوخیز کو یہ کہہ کے بہلاتی تھی میں
ہے یہیں پوشیدہ وہ وارفتۂ فصلِ بہار
کچھ تو کہہ ہم سے بھی اس وارفتگی کا ماجرا
لے گیا تجھ کو کہاں تیرا دلِ بے اختیار
کس تجلی گاہ نے کھینچا ترا دامانِ دل
تیری مشتِ خاک نے کس دیس میں پایا قرار

کیا کہوں اس بُوستانِ غیرتِ فردوس کی
جس کے پھولوں میں ہوا اے ہم نوا میرا گزر
جس کے ذرے مہر عالمتاب کو سامانِ نُور
جس کی طورافروزیوں پہ دیدۂ موسیٰؑ نثار
جس کے بلبل عندلیبِ عقل کے ہم صفیر
جس کے غنچوں کے لئے رُخسار حُور آئینہ دار
خطّۂ جنّت فضا جس کی ہے دامنگیر دل
عظمتِ دیرینۂ ہندوستاں کی یادگار
جس نے اسمِ اعظمِ محبوبؒ کی تاثیر سے
وسعتِ عالم میں پایا صورتِ گردوں وقار
نُور کے ذرّوں سے قدرت نے بنائی یہ زمیں
آئینہ ٹپکے دکن کی خاک اگر پائے فشار
آستانے پر وزارت کے ہوا میرا گزر
بڑھ گیا جس سے مرا ملکِ سخن میں اعتبار
اس قدر حق نے بنایا اس کو عالی مرتبت
آسماں اس آستانے کی ہے اک موجِ غبار
کی وزیرِ شاہ نے وہ عزّت افزائی مری
چرخ کے انجم مری رفعت پہ ہوتے ہیں نثار
مسندآرائے وزارت راجۂ کیواں حشم
روشن اُس کی رائے روشن سے نگاہِ روزگار
اُس کی تقریروں سے رنگیں گلستانِ شاعری

؎ نواب میر محبوب علی خاں سابق نظام دکن۔

اُس کی تحریروں پہ نظمِ مملکت کا انحصار
لیلائے معنی کا محمل اُس کی نثرِ دلپذیر
نظم اُس کی شاہدِ رازِ ازل کی پردہ دار
اُس کے فیضِ پاک کی منت خواہ کانِ لعل خیز
بحرِ گوہر آفریں دستِ کرم سے شرمسار
سلسلہ اس کی مروّت کا یونہی لاانتہا
جس طرح ساحل سے عاری بحرِ ناپیدا کنار
دلربا اس کا تکلم خُلق اُس کا عطرِ گل
غنچۂ دل کے لیے موجِ نفس بادِ بہار
ہو خطا کاری کا ڈر ایسے مدبر کو کہاں
جس پہ ہر تدبیر کی تقدیر ہو آئینہ دار
ہے یہاں شانِ امارت پردہ دارِ شانِ فقر
خرقہ درویشی کا ہے زیرِ قبائے زر نگار
خاکساری جوہرِ آئینۂ عظمت بنی
دست وقفِ کار فرمائی و دل مصروفِ یار
نقش وہ اس کی عنایت نے مرے دل پر کیا
محو کر سکتا نہیں جس کو مُرورِ روزگار
شکریہ احسان کا اقبالؔ لازم تھا مجھے
مدح پیرائی امیروں کی نہیں میرا شعار!

(صفحہ ۲۰۰ تا ۲۰۳)

جب مہاراجہ دوبارہ وزارت عظمٰی کے عہدے پر فائز ہوئے تو اقبالؔ نے درج ذیل

قطعہ تاریخ لکھ کر اُن کو بھیجا

صدرِ اعظم گشت شادِ نکتہ داں
ناوکِ اُو دشمناں راسینۂ سفت
سالِ ایں معنی سروشِ غیب داں
''جانِ سلطاں سرکشن پر شاد گفت''
............۱۳۴۱ھ............

(ص ۲۰۷)

☆

اقبالؔ کے ایک وسیع الخیال ہندو امیر سے یہ گہرے مراسم خود اقبال کی وسیع المشربی کا ناقابل تردید ثبوت اور اُن لوگوں کے لیے جو اقبال کو صرف مسلمانوں کا شاعر بتانے کی کوشش کرتے ہیں۔ایک کھلا چیلنج ہے''۔(ص ۲۰۷)

☆

قارئین کرام! آپ نے مہاراجہ کرشن پرشاد شادؔ کا تعارف اور ''اقبالؔ'' کی نظر میں اس کا مقام'' ملاحظہ فرمایا۔ آپ نے یہ بھی غور فرمایا ہوگا کہ ہندو امیر کے لیے اقبال کتنے اچھے، اونچے اور بلا کے محبت وعقیدت بھرے جذبات رکھتے ہیں۔اب ہم آگے چلتے ہیں۔

☆

سنوسئ ہند امیر ملت حضرت پیر سید جماعت علی شاہ محدث علی پوری رحمتہ اللہ علیہ(۱۹۵۱ء۔۱۸۴۱ء) عالم اسلام کے معروف شیخ طریقت،اقبال کے ہم وطن اور مستند مذہبی پیشوا تھے۔ پوری دنیا میں آپ کے مریدوں کی تعداد ساٹھ لاکھ کے قریب تھی، انہوں نے برصغیر کی ہر مسلم مفاد تحریک میں دل کھول کر دامے درمے قدمے قلمے اور سخنے حصہ لیا۔تحریک خلافت، تحریک مسجد شہید گنج اور تحریک پاکستان میں تو آپ کا کردار تاریخ کا ایک سنہری باب ہے۔ حیدر آباد دکن میں بھی اُن کے بے شمار مرید پائے تھے جن میں عام لوگوں سے لے کر امرائے سلطنت تک شامل تھے۔

''تذکرہ شاہ جماعت'' مطبوعہ لاہور مئی ۱۹۷۳ء کے مصنف سید حیدر حسین علی پوری اپنی (۱۹۸۶ء۔ ۱۹۱۸ء) اپنی کتاب کے صفحہ ۲۲۵ پر رقمطراز ہیں کہ

''ایک دفعہ حضور قبلہ عالم (امیر ملت پیر سید جماعت علی شاہ) حیدرآباد دکن میں قیام فرما تھے۔ سرکشن پرشاد آپ کی خدمت میں حاضر ہوا۔ اور باتوں باتوں میں اُس نے اپنی نسبت کہا کہ ''میں پکا موحد ہوں''۔ حضور نے بے خوف وخطر برجستہ جواب دیا کہ:

''ابلیس بھی پکا موحد ہے۔ اُس نے خود کبھی خدائی کا دعویٰ نہیں کیا۔ نہ ایک سے زیادہ خداؤں کو مانا۔ اُس کا قول قرآن شریف میں موجود ہے۔ انی اخاف اللہ رب العالمین (سورۃ حشر) موحد بن جانے میں کوئی فضیلت نہیں مومن بن جاؤ تو فضیلت ہے اور یہ شعر سنایا۔

بجز حُبِ محمد کامل ایماں ہو نہیں سکتا
خُدا کے ماننے والا مسلماں ہو نہیں سکتا''

☆

اس واقعہ کو مولانا عبدالقادر فیاض بلگوڈوی نے بھی اپنی کتاب ''تذکرہ شاہ جماعت'' مطبوعہ میسور (بھارت) ۱۹۵۴ء کے صفحہ ۲۱۔۱۲۰ پر یُوں بیان کیا ہے۔

''مہاراجہ کرشن پرشاد، حضرت امیر ملت رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور فخراً کہا کہ ''میں ایک پکا موحد ہوں''۔ حضور کی بیباک زبان صداقت ترجمان نے فوراً ٹوکا اور کہا کہ ''ابلیس بھی پکا موحد تھا۔ اُس نے خود کبھی خدائی کا دعویٰ کیا نہ ایک سے زیادہ خداؤں کو مانا۔ اس کا قول قرآن شریف میں ہے، انی اخاف اللہ رب العالمین (سورۃ حشر) یعنی میں اُس خداؐ سے ڈرتا ہوں جو دونوں جہانوں کا مالک ہے'' __ موحد بن جانے میں کوئی فضیلت نہیں، مومن بن جاؤ تو فضیلت ہے۔

بجز حُبِ محمدؐ کامل ایماں ہو نہیں سکتا
خُدا کے ماننے والا مسلماں ہو نہیں سکتا''

☆

اس بات کو مہاراجہ نے توڑ مروڑ کر اور رنگ چڑھا کر علامہ اقبالؔ کی خدمت میں ۲۱ دسمبر ۱۹۱۶ء کو ایک خط لکھا جو درج ذیل ہے۔

''آپ کے لاہور............علی شاہ آج کل بمبئی میں مقیم ہیں۔ اگرچہ یہ حیدر آباد (دکن) میں بھی آئے تھے۔ مگر وہاں ملنے کا اتفاق نہیں ہوا تھا۔ سفر سے واپس ہو کر دو چار روز ہوئے تھے کہ وہاں سے روانہ باشد ہو گئے۔ یہاں میر خورشید علی مرے داماد نے مجبور کیا کہ اُن سے ملوں۔ چلا گیا۔ واہ رے اخلاق اور مہمان داری کہ کیوں آئے، کدھر آئے، کچھ بھی نہ پوچھا۔ چائے کی ایک پیالی پیش کر کے کفر و اسلام کا ذکر چھیڑا۔ روئے سخن بندے کی طرف اور ہر بات میں مجھے ٹوکنا اور متوجہ کرنا شروع کیا۔ میں بھی خموشی سے سنتا گیا۔ آخر میں یہ کہا کہ اگر کوئی اپنے کو موحد کہے اور صرف لا الہ الا اللہ کہے وہ کافر ہے، اور جو کوئی صرف محمدؐ رسول اللہ کہے وہ بھی کافر۔ میں نے سب سن کر کہا کہ مولیٰ! صرف لا الا الا اللہ کہنے والے کے کافر ہونے کی آج ہی میں نے سنی اور جو موحد ہوتا ہے وہ رسالت سے انکار کرتا ہے، یہ بھی آج ہی سنا۔ میری دانست میں رسالت اور وحدت حقیقت میں ایک ہی رنگ ہے۔ تفریق فہم اور مراتب کے تعین کے باعث ہے، ورنہ اللہؑ کا نام باقی جو ہے وہ ہے۔ اس پر تو اور بھی بگڑے اُچھلے۔ بندہ تو اس کے بعد زیادہ بیٹھنا نامناسب خیال کر کے واپس ہوا۔

ہائے افسوس! یہ وردی والے جو صبغۃ اللہ کہلاتے ہیں، اپنے رنگ سے کیوں بے رنگ ہو جاتے ہیں۔ اخلاق کا نام نہیں۔ مہمان نوازی بھی نہیں آتی۔ سمجھے ہوئے ہیں کہ دنیا میں بس یہی ایک ہیں۔ سب انہی

کے ہو جائیں۔ توبہ توبہ! ایں خیال است و محال است و جنوں۔ خدا جانے یہ لوگ میرے لئے کیوں اتنے ساعی ہوتے ہیں اور ان درویش صورت "ملا" سیرتوں کو مجھ سے کیوں بغض اللہ ہے"۔

(اقبال بنام شاد، محمد عبداللہ قریشی، بزم اقبال لاہور جون ۱۹۸۶ء ص ۹۸۔۲۹۷)

☆

قارئین کرام سے استدعا ہے کہ "تذکرہ شاہ جماعت" کے دونوں حوالوں اور مہاراجہ کے اس خط کو بار بار پڑھیں اور انصاف کریں کہ مہاراجہ نے اپنے خط میں بات کو کہاں سے کہاں تک پہنچایا ہے۔ لیجئے اب علامہ اقبال کا جوب بھی ملاحظہ فرمایئے جو انہوں نے ۵ جنوری ۱۹۱۷ء کو لکھا:۔

"حافظ..........علی شاہ صاحب کو میں بہت عرصہ سے جانتا ہوں۔ وہ ہمارے ضلع سیالکوٹ کے رہنے والے ہیں۔ میں اُن کو سلسلہ پیری مریدی کے آغاز سے پہلے بھی جانتا تھا اور اب بھی اُن کے حالات سے ناواقف نہیں ہوں۔ ایک دفعہ بنگلور میں ان کی وجہ سے بہت سے فساد ہونے کو تھا۔ ان کا وجود مسلمانوں میں اختلاف کا باعث ہوا۔ وہاں کے مسلمانوں نے مجھے ایک خط لکھا جس میں یہ تقاضا کیا گیا تھا کہ میں اُن کے حالات بلا رُو رعایت لکھوں تا کہ فساد رفع ہو۔ میں نے جو کچھ معلوم تھا، لکھ دیا۔ الحمد اللہ فساد رفع ہو گیا اور حافظ صاحب مع اپنے مریدوں کے وہاں سے رخصت ہوئے۔ وہ بڑے ہوشیار آدمی ہیں اور پیری مریدی کے فن کو خوب سمجھتے ہیں۔ بے اعتنائی ان لوگوں کی بالعموم مصنوعی ہوتی ہے اور اس میں سینکڑوں اغراض پوشیدہ ہوتی ہیں۔ جس طرح وہ سرکار سے پیش آئے ہیں، اس طرز عمل کا مفہوم بخوبی سمجھتا

ہوں۔ اُن کے ہاں جانے کی کوئی ضرورت نہ تھی۔ آپ اُن کی سمجھ اور گرفت سے بالاتر ہیں۔ عنقائے بلند آشیاں کس کے قابو میں آ سکتا ہے۔ قریب ہے کہ سب سے مستغنی ہو جائیں۔ زیادہ کیا عرض کروں۔ اُمید ہے کہ سرکار کا مزاج بخیر ہوگا۔

خادم کہن

محمد اقبال

(''اقبال نامہ'' مرتبہ شیخ عطاء اللہ، اقبال اکادمی پاکستان لاہور ۲۰۰۵ء صفحہ ۴۶۶، ۴۶۷)

اقبال بنام شاد، محمد عبداللہ قریشی بزم اقبال لاہور ۱۹۸۶ء صفحہ ۱۹۹۔

☆

پیارے قارئین! آپ حیران ہوں گے کہ مہاراجہ نے انتہائی عیاری، دروغ گوئی اور کذب بیانی کا جو شاہکار خط علامہ اقبال کو لکھا، اُس کے جواب میں اقبالؒ نے احقاقِ حق اور ابطال باطل کی بجائے مہاراجہ کے موقف کی تائید کر کے اس کی حوصلہ افزائی کی ہے۔ اب غور طلب امر یہ ہے کہ ۱۹۱۵ء میں اقبال اپنے خط بنام منشی محمد دین فوقؔ میں حضرت امیر ملت پیر سید جماعت علی شاہ محدث علی پوری رحمتہ اللہ علیہ کی مذہبی، ملی، دینی روحانی خدمات کا بصد عقیدت اعتراف کرتے ہیں ملاحظہ ہو:

''ڈیر فوق!

آپ کبھی ملتے ہی نہیں۔ اب تو آپ ''پیر طریقت بھی بن گئے۔ خدا کرے جلد حافظ جماعت علی شاہ صاحب کی طرح آپ کے ورود کشمیر کے متعلق اطلاعیں شائع ہوا کریں۔

والسلام

آپ کا خادم

محمد اقبال

۲۳ جولائی ۱۹۱۵ء

(''حیات اقبال گمشدہ کڑیاں'' محمد عبداللہ قریشی، بزم اقبال لاہور مئی

۱۹۸۲ء صفحہ ۲۸۸)

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ۱۹۱۵ء میں تو اقبال، حافظ جماعت علی شاہ صاحب کی خدمات کا اعتراف کریں، خراج تحسین پیش کریں اور اظہار مسرت کریں مگر ۱۹۱۷ء میں اُن پر بے بنیاد تنقید کے تیرونشتر برسائیں اور وہ بھی ایک ہندو مہاراجہ کی حمایت میں۔ یہ بات سمجھ سے بالاتر ہے۔ پھر آپ کتاب کے پہلے باب ''اقبال بحضور ملت'' میں ملاحظہ فرما چکے ہیں کہ اقبال کو حضرت امیر ملتؒ سے کتنی عقیدت تھی اور حضرتؒ بھی کتنی شفقت فرماتے تھے۔

علامہ اقبال کی رحلت ۱۹۳۸ء میں ہوئی جب کہ مہاراجہ کرشن پرشاد ۱۹۴۰ء میں آنجہانی ہوئے دونوں کی خط و کتابت بعد میں شائع ہوئی۔ میرا گمان غالب ہے کہ یہ خطوط مہاراجہ یا اُس کے کسی مداح کی ایجاد ہیں۔ ورنہ علامہ اقبال سے ایسی توقع ہرگز نہیں ہوسکتی۔ لیکن اگر یہ خط و کتابت واقعی اصل اور حقیقت ہے تو پھر علامہ کی حضرت امیر ملت رحمتہ اللہ علیہ سے عقیدت محبت ظاہر داری کے سوا کیا رہ جاتی ہے؟

بڑی حیران کن بات ہے کہ معروف ماہر اقبالیات محمد عبداللہ قریشی (۱۹۹۴ء۔۱۹۰۵ء) نے اپنی کتاب ''اقبال بنام شاد'' میں اقبال کے مذکورہ خط کے بعد صفحہ ۱۹۹ تا ۲۰۱ پر ''تعلیقات'' کے زیرعنوان حضرت امیر ملت کے حالات، خدمات اور اقبال کی نیازمندی کا ذکر بڑی تفصیل سے کیا ہے مگر خط کے مندرجات پر بالکل لب کشائی کی زحمت گوارا نہیں کی تاکہ حقیقت حال سامنے آتی۔

قریشی صاحب (۱۹۹۴ء۔۱۹۰۵ء) چونکہ میرے استاد گرامی حکیم ملت حضرت حکیم محمد موسیٰ امرتسری ثم لاہوری (۱۹۹۹ء۔۱۹۲۷ء) کے عقیدت مند تھے اور اُن کے مطب واقع ۵۵۔ ریلوے روڈ لاہور پر اکثر وبیشتر حاضری دیتے تھے، وہاں اُن سے ملاقاتیں رہیں لہٰذا

اس سلسلہ میں مَیں نے مہاراجہ اور اقبالؔ کی خط و کتابت میں زیر بحث مسئلے کو سلجھانے کے لیے اُن کی خدمت میں مورخہ ۲۴۔ اپریل ۱۹۸۷ء کو مندرجہ ذیل عریضہ لکھا:

بزرگ محترم حضرت قریشی صاحب

سلام و رحمت۔ اُمید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔

......ایک نہایت ہی اہم مسئلہ درپیش ہے، جناب والا سے رہنمائی کی درخواست ہے۔ وہ یہ کہ میں ایک تفصیلی مضمون ''اقبالؔ اور امیر ملت'' لکھ رہا ہوں۔ ایک واقعہ جسے امیر ملتؒ کے مخالفین اکثر و بیشتر اچھالتے رہتے ہیں، وہ یہ کہ مہاراجہ کرشن پرشاد شادؔ آف حیدر آباد دکن کا خط ہے جو انہوں نے علامہ اقبال کو لکھا تھا، جس میں حضرت امیر ملتؒ کے خلاف زہر اگلا گیا ہے۔ جواباً حضرت علامہ کا خط ہے۔ یہ دونوں خطوط آپ کی کتاب ''اقبال بنام شاد'' کے صفحہ ۱۹۹ اور ۲۹۷ء پر موجود ہیں۔

حیران ہوں کہ مہاراجہ شاد کے بے سر و پا خط کے جواب میں حضرت علامہ نے بھی حضرت امیر ملت کے بارے میں بڑی سخت زبان استعمال کی ہے۔ حالانکہ ''سیرت اقبال'' از پروفیسر محمد طاہر فاروقی، ''ذکر اقبال'' از عبدالمجید سالک و دیگر کتب میں ایسے واقعات درج ہیں جو حضرت امیر ملت اور حضرت علامہ اقبال کے گہرے تعلقات و مراسم کے مظہر ہیں۔ خود آپ نے بھی اپنی کتاب ''اقبال بنام شاد کے صفحہ ۲۰۰ تا ۲۰۱ پر ایسا ہی واقعہ درج فرمایا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ ہر دو حضرات کو ایک دوسرے کا حد درجہ احترام ملحوظ تھا۔

کہیں ایسا تو نہیں ہے کہ اقبال اور شاد کی یہ خط و کتابت جو ۱۷۔۱۹۱۶ء میں ہوئی ہے، اس وقت تک حضرت علامہ حضرت امیر ملت سے کھل کر نہ مل سکے ہوں اور مخالفین کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کا شکار ہو گئے ہوں۔ اور اسی بنا پر حضرت امیر ملت کے خلاف اپنے ریمارکس دیئے ہوں۔

شاد نے اپنے خط میں جو الزام تراشی کی ہے، اُسے پڑھ کر ہی معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ سب کچھ حسد و بغض پر محمول ہے۔ حضرت امیر ملت تو حد درجہ بااخلاق، ''مہمان نواز'' اور

''تالیف قلب'' کرنے والے بزرگ تھے۔ اور پھر یہ بات کتنی مضحکہ خیز لکھی ہے کہ ''جو کوئی صرف محمد رسول اللہ کہے وہ بھی کافر''۔ حالانکہ حضرت امیر ملّت فرمایا کرتے تھے کہ ''صرف لاالہ الا اللہ پڑھنے سے کوئی شخص مسلمان نہیں ہو سکتا کیونکہ اس میں رسالت کا اقرار نہیں ہے، البتہ ''محمد رسولؐ اللہ'' کہنے سے مسلمان ہو جاتا ہے کیونکہ اس میں ''توحید و رسالت'' دونوں کا اقرار ہے لیکن مہاراجہ نے لکھا ہے کہ ''محمد رسولؐ اللہ'' کہنے والا بھی کافر ہے۔ یہ بات کسی لحاظ سے بھی درست نہیں ہے۔

''ملفوظات امیر ملت'' مطبوعہ ۱۹۷۶ء کے صفحہ ۲۹ پر یوں لکھا ہے کہ:

''فقط لا الہ الا اللہ'' پڑھ لیا تو موحد بن گیا، مومن نہیں بنا۔ مومن کب بنے گا جب ''محمد رسول اللہ'' پورا پڑھے گا........

صفحہ ۳۰ پر ہے کہ:

''صرف محمد رسول اللہ پڑھا لیا تو شرع کی رُو سے مومن بن گیا۔ اس میں توحید بھی آ گئی اور رسالت بھی آ گئی۔''

حیرانی اس بات پر ہے کہ ۱۹۱۷ء میں حضرت علامہ، شاؔد کے خط کے جواب میں حضرت امیر ملتؒ پر تنقید کر رہے ہیں، مخالفت کر رہے ہیں بلکہ بیزاری کا اظہار کر رہے ہیں مگر ۲۳ جولائی ۱۹۱۵ء کے ایک خط بنام فوقؔ میں حضرت امیر ملتؒ کے لیے تعریفی جملہ لکھ رہے ہیں:

''خدا کرے کہ جلد حافظ جماعت علی شاہ صاحب کی طرح آپ کے ورود کشمیر کے متعلق اطلاعیں شائع ہوا کریں۔'' (انوار اقبال مرتبہ بشیر احمد ڈار مطبوعہ کراچی ۱۹۶۷ء ص ۶۰)

اسی طرح سید نذیر نیازی (۱۹۸۱۔۱۹۰۰ء) بھی اپنی کتاب ''دانائے راز'' مطبوعہ لاہور ۱۹۷۹ء کے ص ۱۸۶ پر رقمطراز ہیں کہ اقبالؔ نے فوقؔ کو ایک خط لکھا:۔

''آپ تو پیر طریقت ہیں۔ خداؐ کرے آپ بھی کسی روز پیر جماعت علی

شاہ کی طرح کشمیر جا پہنچیں۔"

یہ خط بھی ۱۹۱۵ء کا ہے۔ غالباً اسی خط کو آپ نے اپنی کتاب "حیات اقبال کی گمشدہ کڑیاں" کے صف ۲۸۸ پر یوں درج کیا ہے۔

ڈیر فوق!

آپ کبھی ملتے ہی نہیں۔ اب تو آپ "پیر طریقت" بھی بن گئے خدا کرے جلد حافظ جماعت علی شاہ صاحب کی طرح آپ کے ورود کشمیر کے متعلق اطلاعیں شائع ہوا کریں۔ والسلام

آپ کا خادم

۲۳ جولائی ۱۹۱۵ء محمد اقبال

اب یہ بات سمجھ میں نہیں آتی کہ حضرت علامہ ۱۹۱۵ء میں حضرت امیر ملت کا ذکر بڑی محبت سے کریں مگر ۱۹۱۷ء میں شاد کے خط کے جواب میں بڑے سخت الفاظ استعمال کریں۔ آخر وجہ کیا؟ براہ کرام مجھے اس پریشانی سے نجات دلائیے، کیونکہ میں حضرت امیر ملت اور حضرت علامہ (دونوں) کا عقیدت مند اور مداح ہوں۔

اگر چہ آپ کو زحمت تو ہوگی مگر آپ کے اخلاق کریمانہ سے توقع ہے کہ ازراہ کرم جلد جواب گرامی سے نواز کر مجھے ذہنی اذیت سے نجات دلائیں گے تاکہ اپنا مقالہ مکمل کر سکوں۔ شکریہ۔

والسلام

محمد صادق قصوری

قریشی صاحب نے ۱۲ مئی ۱۹۸۷ء کو درج ذیل جواب سے نوازا۔

محب مکرم۔ السلام علیکم۔ آپ کا خط ملا، یاد فرمائی کا شکریہ۔

"اقبال بنام شاد" کے صفحہ ۱۹۹ اور ۲۹۷ پر اقبال اور مہاراجہ کشن پرشاد کے جو خط موجود ہیں، اُن کی کوئی توجیہ نہیں کی جا سکی۔ مہاراجہ جس عقیدت کے ساتھ ملنے گئے تھے، اس میں

انہیں سخت ناکامی ہوئی اور اس کا شکوہ انہوں نے اقبآل سے کیا اور اقبآل نے ان کی دلجوئی کی۔ کیونکہ وہ خود بھی مہاراجہ کو موحد سمجھتے تھے اور اُن کے لیے کسی ملائم جواب کی توقع رکھتے تھے۔"

مخلص

محمد عبداللہ قریشی

قارئین حضرات خود ہی فیصلہ فرمائیں کہ کیا قریشی صاحب کا گرامی نامہ میرے تفصیلی عریضہ کا صحیح جواب ہے؟ کیا اس سے معمولی پڑھا لکھا بھی مطمئن ہوسکتا ہے کہ ایک مسلمان ولی کامل کے مقابلے میں ایک ہندو مہاراجہ اور امیر کبیر کی خواہ مخواہ حمایت کی جارہی ہے۔

کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے

اس سلسلے میں نامور دانشور ڈاکٹر سید معین الرحمٰن (ف ۲۰۰۵ء) کا تبصرہ قابل غور ہے۔

"مہاراجہ کشن پرشاد اور اقبآل کا باہمی مراسلت ۱۰۱ خطوط پر مبنی ہے۔ ۴۹ خط اقبال کے اور ۵۲ شاد کے ہیں۔ یہ خط و کتابت نومبر ۱۹۱۶ء تا ۴ جنوری ۱۹۲۷ء تک پھیلی ہوئی ہے۔

مہاراجہ کشن پرشاد کے نام اقبال کے خطوط کے بارے میں پروفیسر آل احمد سرور نے لکھا ہے کہ

"یہ خط اقبال کی پوری شخصیت کو سمجھنے کے لئے زیادہ مفید نہیں"۔

("جہان اقبال" از ڈاکٹر سید معین الرحمٰن، اقبال اکادمی لاہور ۱۹۹۷ء ص ۱۴۳، ۱۴۴)

☆

اقبال کا متذکرہ بالا جوابی خط پہنچنے پر شاد نے مورخہ ۲۴ جنوری ۱۹۱۷ء کو جو دوسرا خط علامہ کو لکھا، وہ کچھ یوں ہے۔

"حافظ.........علی شاہ صاحب کی موافق یا مخالف شتر گربہ شہرت اور عزیزی میر خورشید علی سلمہ کا اصرار میرے لیے مرزا غالب کے شعر کا مصداق بن گیا۔ میرا فطرتی مادہ

یعنی اہل فقر کی زیارت اور خدمت کشاں کشاں لے گیا:

لکھنؤ دام نشاطے سرِ راہم گسترد
بے خود از ولولۂ شوق پُر افشاں رفتم

☆

اس کے بعد کی سرگزشت سے تو پہلے ہی مطلع کر چکا ہوں''

پیارے قارئین! شاد کے اس خط کی پہلی سطر میں ''موافق یا مخالف شتر گربہ شہرت'' کے الفاظ پر خصوصی توجہ مبذول فرمایئے گا۔ کیا یہ طرز تحریر شرفاء کی زبان ہے اور حیرت ہوئی ہے کہ علامہ اقبال نے اس کو گوارا کیا اور شاد کی پشت پناہی جاری رکھی جو خود تو حضرت امیر ملت کو اخلاق سے عاری قرار دیتے ہیں مگر خود اُن کے اپنے ہر دو خطوط اخلاقی قدروں سے کوسوں دور ہیں۔

مہاراجہ نے اس کے بعد حضرت امیر ملت رحمۃ اللہ علیہ کی کردار کشی کو اپنا فرض سمجھ لیا۔ حیدرآباد دکن میں جب بھی حضرت تشریف لائے، مہاراجہ نے اُن کے دوروں میں رکاوٹیں ڈالیں اور اُن کے تبلیغی مشن کو کھوٹا کرنے کی سعی ناروا کی مگر ہر بار منہ کی کھائی ۔

فانوس بن کے جس کی حفاظت ہوا کرے
وہ شمع کیوں بجھے جسے روشن خداؒ کرے

☆

۱۹۲۲ء میں نظام دکن میر عثمان علی خاں (۱۹۶۷ـ۱۸۸۶ء) کے مرشد گرامی حضرت مولانا خیر المبین صدیقی کا انتقال پر ملال ہوا تو نماز جنازہ حسب وصیت حضرت امیر ملتؒ نے پڑھائی۔ جب مولانا کو قبر میں رکھنے کے بعد مٹی دینے کا مرحلہ آیا تو مہاراجہ کشن پرشاد بھی آ دھمکے اور آگے بڑھ کر مٹی دینے لگے۔

حضرت امیر ملت کی نظر پڑی تو فرمایا:

''کیا مسلمان مر گئے، مٹی کیوں نہیں دیتے، کافر دیتے ہیں اور مسلمان

تماشا دیکھتے ہیں''۔

اس پر مہاراجہ پیچھے ہٹ گیا اور وہاں سے چلا گیا۔

''انوار شاہ جماعت'' (قلمی) جلد اول مصنفہ مرزا ذوالفقار علی بیگ فیاضؔ حیدر آبادی ص ۳۴۲، ''سیرت امیر ملت'' از سید اختر حسین علی پوری پروفیسر محمد طاہر فاروقی مطبوعہ ۱۹۷۵ء ص ۳۰۲)

☆

۱۹۲۵ء میں حضرت امیر ملت رحمتہ اللہ علیہ حیدر آباد دکن کے روحانی دورہ پر تشریف لے گئے تو پھر مہاراجہ کشن پرشاد نے آپ کے خلاف سازشیں کر کے پریشان کرنے مذموم کوشش کی۔ خدا کی شان دیکھئے کہ انہی دنوں نظام دکن اعلیٰ حضرت میر عثمان علی خان کی صاحبزادی کا انتقال پر ملال ہو گیا۔ مکہ مسجد میں نماز جنازہ پڑھی گئی۔ جب نماز جنازہ شروع ہونے لگی تو مہاراجہ پہلی صف میں کھڑا ہو گیا۔ کسی نے اس کو منع نہ کیا۔ اس موقعہ پر بھی حضرت امیر ملتؒ نے حق گوئی و بیباکی کا مظاہرہ کرتے ہوئے فرمایا:

''اس کو مسجد سے باہر کرو ورنہ سب کی نماز پلید ہوگی۔''

چنانچہ مہاراجہ چپکے سے صف سے نکل کر باہر چلا گیا۔ اس پر نظام نے بھی کہا:

''ہاں ہاں! شاہ صاحب صحیح فرماتے ہیں''

تجہیز و تکفین ہو چکی تو تین دن بعد مہاراجہ نے نظام دکن کی توجہ اس واقعہ کی جانب مبذول کرائی۔ نظام نے فوراً کہا!

''مہاراج! آپ کیوں نماز جنازہ کے واسطے آئے تھے۔ میں اس امر میں کچھ نہیں کر سکتا''

(''انوار شاہ جماعت'' (قلمی) جلد اول مصنفہ مرزا ذوالفقار علی بیگ فیاض حیدر آبادی صفحہ ۳۴۳)

☆

جون ۱۹۲۹ء میں حضرت امیر ملت رحمتہ اللہ علیہ حیدر آباد دکن کے دورہ پر تشریف لائے تو ایک دن کسی نے آپ سے یہ واقعہ عرض کیا کہ مہاراجہ کشن پرشاد وزیر اعظم حیدر آباد دکن نے ایک زنانہ ہائی سکول کی نوعمر سیدزادی کو اغواء کر کے نشانہ ہوس بنایا اور پھر زبردستی اپنی زوجیت میں لے آیا ہے۔ ''تذکرہ شاہ جماعت'' کے مصنف لکھتے ہیں کہ:

''اس پر آپ نے روزانہ کی مجالس وعظ میں اُس کی خوب خبر لی اور سادات کی خاندانی عظمت اور نسبی شرافت کے متعلق وضاحت فرمائی اور احتراماً غیر سیّد سے سیّد زادی کے نکاح کو غیر صحیح قرار دیا (جب کہ یہاں مسئلہ غیر سید کا نہیں بلکہ غیر مسلم کا بھی تھا۔ اس مسئلہ پر دارالافتائے جامعہ نظامیہ حیدر آباد دکن کا فتویٰ بھی شائع ہو چکا تھا) جب آپ نے یہ مسئلہ بیان فرمایا تو تمام مسلمانوں میں اس وزیر کے خلاف جذبۂ نفرت پیدا ہوگیا جس سے وہ گھبرا گیا اور آپ کے خلاف ناجائز حربے استعمال کرنے لگا۔ پولیس والے آپ کے مواعظ نوٹ کرنے لگے اور وہ خود بعض (نام نہاد) علماء ومشائخ اور امرائے سلطنت کو اپنا ہمنوا بنا کر آپ کے خلاف شکایات حضور نظام کو پہنچانے لگا۔ جب آپ کو اس کا علم ہوا تو آپ نے دورانِ وعظ اس کی ریشہ دوانیوں کا ذکر کر کے بلند حوصلگی سے فرمایا کہ:

''معلوم ہوا ہے کہ فقیر کے خلاف حضور نظام کو رپورٹیں پہنچائی جا رہی ہیں۔ کان کھول کر سنو کہ جہاں فقیر وعظ سنا رہا ہے اگر یہاں نظام کی حکومت چل سکتی ہے تو فقیر اللہ کے گھر میں جا بیٹھے گا جہاں کسی کی حکومت نہ ہوگی۔ فقیر کو حق بات کہنے سے کوئی طاقت روک نہیں سکتی۔ فقیر ''سیّد'' ہے اور ''سید'' کا کام ڈرنا نہیں ہے جو ڈرتا ہے وہ ''سیّد'' نہیں ہے۔''

آپ کے اس جرات مندانہ اعلان سے وزیر (مہاراجہ) اور اُس کے ہمنواؤں کے حوصلے پست ہوگئے اور آپ حسب معمول پندو موعظمت، رشد و ہدایت میں مشغول رہے''۔

(سید حیدر حسین علی پوری، ''تذکرہ شاہ جماعت'' مطبوعہ لاہور ۱۹۷۳ء صفحہ ۲۳۵، ۲۳۶)

☆

مرزا ذوالفقار علی بیگ فیاض حیدر آبادی (۱۹۹۳ـ۱۹۱۰ء) جو حضرت امیر ملتؒ کے حیدر آباد دکن کے دوروں کی ڈائری قلمبند کرتے تھے، وہ لکھتے ہیں کہ حیدر آباد دکن کے نام نہاد مشائخ حضرت قبلہ عالم امیر ملت سے عناد رکھتے تھے جن کی سرپرستی مہاراجہ کشن پرشاد کرتا تھا۔ جون ۱۹۲۹ء میں حضرت امیر ملت، حیدر آباد دکن تشریف لے گئے ایک دن کسی نے حضور قبلہ عالم سے یہ واقعہ عرض کر دیا کہ مہاراجہ کرشن پرشاد نے ایک سیّدانی سے عقد کیا ہے۔ حضرت نے حیدر آباد اور سکندر آباد میں وعظ میں احترامِ سادات پر روشنی ڈالی۔ ۲۸ اگست ۱۹۲۹ء کو آپ نے بنی خانہ میں ''حرمت پردہ'' پر بصیرت افروز وعظ فرمایا۔ یہاں نظام دکن بھی تشریف فرما تھے۔ اس کے تیسرے یا چوتھے دن پھر وعظ فرمایا اور ''احترام سادات'' پر بڑی تفصیل سے روشنی ڈالی۔ مخالفین نے توڑ مروڑ کر بیان کرنا شروع کیا تا کہ عوام بدظن ہوں اور آپ کے پاس نہ جائیں۔ لیکن معاندین و حاسدین کی بات نہ بن سکی۔

پھر ان گندم نما جو فروش مشائخ حیدر آباد دکن نے مہاراجہ کشن پرشاد کی شہ پر ایک محضر نامہ تیار کر کے نظام دکن کی خدمت میں پیش کیا تا کہ حضرت امیر ملتؒ کی حیدر آباد میں آمدورفت مسدود کر دی جائے۔ مریدوں کے لیے یہ بڑا کڑا امتحان تھا۔ نواب دکن کے اکثر مصاحبین مرید تھے۔ وہ سب حیران و پریشان کہ اب کیا ہوگا۔ نظام کے عتاب سے سب خائف تھے۔ ان اشرار کی پشت پناہی در پردہ مہاراجہ کرشن پرشاد کر رہا تھا۔

نواب نُور الضیاء المخاطب نواب ضیا یار جنگ بہادر مفتی اعظم ریاست نظام حیدر آباد دکن

فرماتے ہیں کہ مجھ کو سب خبریں پہنچ رہی تھیں۔ میں خاموش تھا، موقع کا منتظر تھا۔ جب محضر نامہ اعلیٰ حضرت نظام دکن کے پاس پیش ہونے کی خبر مجھ کو ملی تو میں نے کہا، اب ٹھیک ہے۔ اعلیٰ حضرت نے مجھ کو ٹیلی فون کیا۔ حکم ہوا کہ فوراً حاضر ہو، اور ایک چوبدار بھی اسی حکم کے ساتھ میرے پاس بھیجا گیا۔ میں نے پگڑی (دستار) پہنی۔ بگلوس (پیٹی Belt) کمر سے باندھا اور نہایت سکون و اطمینان کے ساتھ روانہ ہوا۔ مجھ کو یقین تھا کہ حضرت پیر جماعت علی شاہ صاحب کی توجہ میرے ہمراہ ہے۔ کنگ کوٹھی پہنچا۔ احمد علی ملازم خاص اعلیٰ حضرت نظام صاحب نے مجھ سے کہا، ''سرکار منتظر آپ کی آمد کے ہیں، جلدی تشریف لائیے''۔

میں اس کے پیچھے چلا، دور سے دیکھا کہ اعلیٰ حضرت خلد اللہ ملکہٗ برآمدہ میں ٹہل رہے ہیں، اُن کا ایک ہاتھ پشت ہے۔ اس ہاتھ میں ایک بڑا کاغذ ہے۔ میں قریب پہنچا تو مجھ کو دیکھ کر کھڑے ہوگئے۔ میں نے سلام کیا۔ اعلیٰ حضرت نے وہ کاغذ میری طرف بڑھایا اور فرمایا، ''ضیا! دیکھو! شہر میں نقص امن ہونے کا قومی اندیشہ ہوگیا ہے شاہ صاحب (حضور قبلہ عالم امیر ملت مدظلہ) نے کیا فرمایا؟ اس کو پڑھو''۔ میں نے وہ محضر لیا، پڑھا۔ اعلیٰ حضرت نے فرمایا، ''شاہ صاحب جید عالم ہیں، جہاندیدہ ہیں اور ولی ہیں''۔ میں نے عرض کیا، سرکار ذرا بھی تردد نہ فرمائیں، محضر پیش کرنے والے صاحبان کو غلط فہمی ہوئی ہے جو بآسانی رفع ہوسکتی ہے۔ اعلیٰ حضرت نے فرمایا، تو پھر تم کیا چاہتے ہو؟ میں نے عرض کیا، آج ہی فدوی وعظ کرے گا اور انشاء اللہ ان حضرات کی تشفی ہو جائے گی۔ اعلیٰ حضرت نے محضر مجھ سے لے لیا اور فرمایا، ''یہ میرے پاس رہنے دو...... شاہ صاحب کے ہزارہا مرید میری ریاست میں ہیں، چنگاری کو شعلہ نہ بننے دو، جاؤ''۔ میں سلام بجالا کے واپس آ گیا۔

یہ وقت صبح نو بجے کا تھا۔ میں نے اعلان کرا دیا کہ بادشاہی ہی عاشورہ خانہ میں میرا وعظ آٹھ بجے شب ہوگا۔ بہت مخلوق آئی۔ محضر پیش کرنے والوں میں سے تقریباً سب کے سب یکے بعد دیگرے میرے گھر آئے تھے۔ وعظ میں اپنی طرف سے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں تھی۔ قرآن شریف و احادیث شریف سے میں نے حضرت پیر صاحب قبلہ کے ہر ارشاد

کو اس طرح ثابت کر دیا کہ یہ محضر پیش کرنے والے قائل ہو گئے۔ اور یہ بات بھی صاف صاف کہہ دی کہ جو یہ کہتا ہے کہ حضرت پیر صاحب نے یہ فرمایا کہ ''جن غیر سیدوں کے نکاح میں سیدانیاں ہیں وہ طلاق دے دیں''۔ یہ محض بہتان عظیم ہے حضرت پیر صاحب پر۔ پیر صاحب جید عالم ہیں، جہاندیدہ ہیں، آل رسول صلی اللہ علیہ وسلم ہیں، پیروں کے پیر ہیں۔ جو تصدیق کرنا چاہتے ہیں میں ان کو اپنے ہمراہ پیر صاحب کے پاس لے چلوں گا، تصدیق کرا دوں گا۔ سب کے سب گردنیں جھکائے خاموش بیٹھے رہے۔ دوسری صبح میں اعلیٰ حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا تو اُن کے چہرے سے خوشی نمایاں تھی۔ اُن کی سی۔آئی۔ڈی پل پل کی خبریں اُن کو پہنچاتی ہے۔ اُن کو سب خبر تھی۔ فرمایا!

> ''شاہ صاحب برسوں سے یہاں آتے ہیں، میں ان کو بلاتا ہوں۔ اُن کے لاکھوں مرید ساری دنیا میں ہیں، چند لوگوں کو اُن سے حسد ہو گیا ہے۔ حق بات کو سیاسی مسئلہ بنانا فتنہ پروری ہے، اب مخالفین نے شکست کھائی۔''

نواب ضیا یار جنگ بہادر کا ارشاد ہے کہ یہ دو تین کتابیں پڑھ کر علامہ بننے والے، رنگین کپڑے پہن کر شاہ صاحب بننے والے، پیر سید جماعت علی شاہ صاحب کی قدر کیونکر کر سکتے ہیں۔ پیر صاحب کی آمد سے ان بہروپیوں کی آمدنی گھٹ گئی۔ باپ دادا کا نام جپتے رہتے ہیں۔ وہ تو کچھ تھے، ان سے پوچھو کہ تم کیا ہو؟

ان افتخرت باباء مضوا اسلفا

قلنا صدقت ولکن بیسن ماولدوا

(ترجمہ: اگر تم کو اپنے بڑوں پر فخر ہے تو ہم بھی تسلیم کرتے ہیں وہ ایسے ہی تھے مگر اولاد بُری چھوڑ گئے)'' (انوار شاہ جماعت'' (قلمی) جلد سوم، مرزا ذوالفقار علی بیگ فیاض صفحہ ۱۴۵ تا ۱۴۸)

☆

اس ناکامی و نامرادی کے بعد مہاراجہ کرشن پرشاد نے زر خرید خوشامدی لوگوں کے ذریعے غنڈہ گردی، اشتہار بازی اور کردار کشی کی مذموم کوشش کی۔ پھر یہ بھی مشہور کیا کہ اعلیٰ حضرت نظام نے آپ کو وعظ کرنے سے منع فرما دیا ہے۔ حالانکہ آپ ہر تیسرے چوتھے دن کسی نہ کسی مسجد میں وعظ فرماتے رہتے تھے۔ اس دور قیام کا آخری وعظ ۱۷ ستمبر ۱۹۲۹ء کو ہوا جو ''ضرورت بیعت'' اور ''محبت رسول ﷺ'' کے موضوع پر تھا۔ ۲۰ ستمبر ۱۹۲۹ء کو آپ واپس علی پور سیّداں تشریف لے آئے تو پھر مہاراجہ کے کارندوں نے پروپیگنڈا شروع کر دیا کہ حضور نظام صاحب نے آپ کو حیدر آباد دکن آنے سے منع کر دیا ہے۔

۱۰ جولائی ۱۹۳۱ء کو حضرت امیر ملتؒ پھر حیدر آباد دکن جلوہ افروز ہوئے اور حسب معمول وعظ و تبلیغ کی مجالس آراستہ ہوتی رہیں۔ ۱۷ جولائی ۱۹۳۱ء بمقام بنی خانہ میں اعلان وعظ فرمایا تو ہزاروں لوگ شریک ہوئے۔ اعلیٰ حضرت نظام دکن میر عثمان علی خان بھی تشریف لائے۔ موضوع تھا ''حیات النبی ﷺ'' ۔ پھر اس دورہ کا آخری وعظ ۱۵/اگست ۱۹۳۱ء کو ''محبت رسول ﷺ'' کے موضوع پر بھی بنی خانہ میں ہوا جس میں حضور نظام اپنے مصاحبین کے ساتھ شریک ہوئے (حوالہ ایضاً صفحہ ۱۵۰، ۱۵۱)

☆

جب کوئی تدبیر کارگر نہ ہوئی تو مہاراجہ کشن پرشاد کے خوشامدی ٹڈوں نے ایک مذموم ہتھکنڈہ استعمال کیا کہ حضرت امیر ملت قبلہ عالم کے ارشادات کے رد میں فتاوے چھپوا کر مساجد اور عام مقامات پر چسپاں کروائے گئے۔ جب اس مذموم حرکت اور فعل کی خبر بیرون ریاست پہنچی تو مدراس، بنگلور، بمبئی، احمد آباد، لاہور، امرتسر، آگرہ، مراد آباد، ڈھاکہ، کلکتہ کے یاران طریقت نے قرآن شریف اور احادیث شریفہ کے حوالے سے جوابی فتاوے چھپوائے۔ اب سوال یہ درپیش ہوا کہ یہ فتاوے ریاست میں کس کو بھیجے جائیں اور کیونکر؟ حضرت اقدس کے جان نثار مرید محمد قاسم تاجر چوب پتھر گٹی حیدر آباد دکن نے اپنی خدمات پیش کیں اور وہ ہر قسم کی پروا کیے بغیر راتوں کی تاریکی میں حیدر آباد و سکندر آباد دونوں شہروں

میں جہاں جہاں مخالفین نے اپنا فتویٰ چسپاں کیا تھا، اُس کے برابر یہ بھی فتویٰ چسپاں کرتے رہے۔ لوگ دونوں فتوؤں کو پڑھتے تھے اور احقاقِ حق اور ابطالِ باطل کا فیصلہ کرتے تھے، حتیٰ کہ مخالفین و معاندین کے فتوؤں کا اثر زائل ہونا شروع ہوگیا اور وہ خاسر و نامراد ٹھہرے۔

بغض و عناد کی آتش سوزاں جو اُن لوگوں کے اندر پورے جوبن سے جل رہی تھی، وہ بھلا کب انہیں چین سے بیٹھنے دیتی تھی۔ اُنہوں نے ایک اور ترکیب سوچی، ایک شخص کو مشائخ کی طرح ملبوسات میں ملبوس کر کے اعلیٰ حضرت نظام کے حضور بھیجا۔ اُس نے جو کہنا تھا، کہا اور خوب مرچ مصالحہ لگا کر کہا۔

اعلیٰ حضرت چونکے اور فرمایا:

''مابدولت کو کل کیفیت کا علم ہے۔ جنہوں نے اس کام کی ابتدا کی وہی سزا کے مستحق ہیں۔''

یہ سنتے ہی وہ صاحب کانپنے لگے اور پھر ایک لفظ بھی نہ بول سکے۔ اعلیٰ حضرت نے اُن کو حکم دیا کہ وہ یہاں سے چلے جائیں۔ بے چارے گھُرکی کھا کے سات کے بجائے بے شمار سلام بجالاتے ہوئے اُلٹے پیر پیچھے ہٹے اور پھر پلٹ کر بہت تیز چلتے ہوئے کنگ کوٹھی سے باہر آ کر دم لیا۔ ذرا ہوش و حواس بجا ہوئے تو اپنے گھر کی راہ لی: جان بچی سو لاکھوں پائے خیر سے بدھو گھر کو آئے

اس کے بعد مخالفین و معاندین کے خرمن اُمید پر اوس پڑ گئی اور چپ ہوگئے۔'' (حوالہ ایضاً صفحہ ۱۵۲ تا ۱۵۴)

قارئین کرام! پڑھ لی تفصیل آپ نے مہاراجہ کشن پرشاد کی اسلام دشمنی کی اور معلوم کر لیا اس کی سازشوں، حرکتوں اور ریشہ دوانیوں کو۔ علامہ اقبال کو بھلا اس کی ان کرتوتوں کا کیا علم تھا، ورنہ وہ کبھی بھی ایسے شخص کے ساتھ تعلقات استوار نہ کرتے جس کا ظاہر کچھ اور باطن کچھ ہے۔ اگر وہ واقعی موحد تھا تو اُسے اسلام قبول کرنے میں کون سی دقت اور رکاوٹ تھی۔ دراصل یہ لوگ اپنے ذاتی اور سیاسی مفادات کی خاطر اسلام کا نام استعمال کرتے ہیں۔ جیسا

کہ تحریک خلافت کے ابتدائی زمانے میں مسلمان ابھی پوری طرح میدان میں نہیں اُترے تھے، تحریک میں گاندھی جی کی دلچسپی بعض دور اندیش مسلمانوں کے لیے حیرت کا موجب بنی ہوئی تھی اور آپس میں یہ پوچھا جا رہا تھا کہ گاندھی جی کس مقصد کے تحت تحریک پر اتنے مہربان ہیں۔ انہی ایام میں گاندھی جی نے مسیح الملک حکیم اجمل خانؒ کو مشورہ دیا کہ تحریک کے لیڈروں کو چاہئے کہ مولویوں اور مذہبی دیوانوں کو اپنے ساتھ ملائیں۔ گاندھی جی کا خیال تھا کہ اُن کے ملائے بغیر تحریک قوت نہیں پکڑ سکتی اور عوامی تحریک نہیں بن سکتی۔ چنانچہ اس مشورے کے مطابق خلافت کے زعماء کا ایک وفد جس میں حکیم اجمل خان، مولانا محمد علی جوہر، مولانا شوکت علی اور دوسرے لیڈر شامل تھے، حضرت امیر ملتؒ کے استاذ گرامی مولانا محمد علی مونگیریؒ سے ملنے کے لیے گئے۔ مولانا مونگیریؒ صرف اپنے علاقے میں ہی نہیں بلکہ پورے ہندوستان کی بڑی مؤثر شخصیت تھے۔

وفد کے ہمراہ جب گاندھی جی بھی مولانا مونگیریؒ کی خدمت میں حاضر ہوئے تو گاندھی جی نے مولانا سے نہایت ادب کے ساتھ کہا:

> ''مولانا! میں نے آنحضرت ﷺ کی سیرت کا مطالعہ کیا ہے۔ اور حضور ﷺ کی شخصیت سے بے حد متاثر ہوا ہوں۔ آپ دنیا کے عظیم ترین انسان تھے۔ اس کے علاوہ میں نے قرآن کریم کا مطالعہ کیا ہے۔ یہ عظیم کتاب ہے اور اُس نے میرے دل و دماغ پر گہرا اثر کیا ہے''۔

مولانا مونگیری، گاندھی جی کی ان باتوں کو خاموشی سے سنتے رہے اور جب گاندھی جی اپنی بات کہہ چکے تو مولانا نے پوچھا:

> ''مجھے آپ اسلام کی وہ بات بتایئے جو آپ کو پسند نہیں آئی۔ اور حضور سیّد عالم علیہ التحیہ والثناء کی سیرت کے اُس کمزور پہلو سے آگاہ کیجئے جسے آپ نے اچھا نہیں سمجھا''۔

گاندھی جی اس سوال کے لیے تیار نہ تھے۔ کچھ چونکے اور فوراً بولے، ایسا تو کوئی پہلو

میری نظر میں نہیں آیا۔'' اس پر مولانا مونگیری نے سوال کیا: تو پھر آپ نے ابھی تک اسلام قبول نہیں کیا؟ گاندھی جی کے پاس کوئی جواب نہ تھا۔ مولانا خفا ہو گئے اور فرمایا:۔

''آپ نے جو کچھ کہا غلط ہے۔ آپ ہمیں صرف پھانسنا چاہتے ہیں۔
صیاد بھی پرندوں کو پکڑنے کے لیے انہی کی بولیاں بولا کرتا ہے''۔

اس پر گاندھی جی کی منافقت کا پردہ چاک ہو گیا اور وہ اپنا سا منہ لے کر رہ گئے۔

(سیرت امیر ملت جلد اول از سید اختر حسین علی پوری مطبوعہ لاہور مئی ۲۰۰۸ء ص ۱۰۶، ۱۰۷)

(''مہر منیر از مولانا فیض احمد فیض مطبوعہ گولڑہ شریف طبع سوم ۱۹۷۶ء ص ۶۷۲-۶۷۳ بحوالہ روزنامہ کوہستان لاہور بابت ۲۵ نومبر ۱۹۶۵ء (احسان بی اے کی ڈائری)

غیر مسلموں نے ہر دور میں اسلام کو اپنے مقاصد کے لیے استعمال کیا ہے منافقین مکہ سے لے کر اب تک کی تاریخ کے اوراق کی ورق گردانی کر کے اس حقیقت تک پہنچنا از بس ضروری ہے کہ ان منافقین نے اسلام کو کتنا نقصان پہنچایا۔ حضرت امیر ملت نے حیدر آباد دکن کے مہاراجہ کشن پرشاد کا پردہ چاک کیا تو وہ درپے آزار ہو گیا۔ مگر اسلام کے اس عظیم مردِ جلیل نے ہر قسم کی پریشانیوں کو بالائے طاق رکھ کر اُس کی منافقت کا پوسٹ مارٹم کر کے رکھ دیا۔ حیدر آباد دکن کے باہر بھی آپ نے مہاراجہ کی منافقت کا پردہ چاک کیا۔ چنانچہ ۲۷ نومبر ۱۹۲۴ء کو آپ نے جامع مسجد آگرہ میں وعظ فرماتے ہوئے ارشاد کیا:

''حیدر آباد دکن میں ایک مرتبہ مہاراجہ کشن پرشاد وزیر ریاست فقیر سے ملنے کے لیے آیا۔ جب اُس کے عقاید کی بابت گفتگو ہوئی تو کہنے لگا، حضرت! نہ میں مسلم نہ میں ہندو...... میں تو موحد ہوں۔ میں نے کہا، راجہ صاحب! موحد تو شیطان بھی ہے مگر لعنت کا طوق گردن میں پڑا ہوا

ہے۔اُس کی توحید اس کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکی کہ اُس نے آدم علیہ السّلام نبی کا انکار کیا۔ جب تک رسالت کا اقرار نہ ہو، صرف توحید کے ماننے سے زیادہ سے زیادہ شیطان بن سکتے ہیں ('' سیرت امیر ملت ص ۶۳۹، ۶۴۰) مطبوعہ ۱۹۷۵ء

☆

گزشتہ صفحات میں اگر چہ ہم مہاراجہ کشن پرشاد کے اس الزام کا جواب دے چکے ہیں کہ بوقت ملاقات حضرت قبلہ عالم امیر ملت نے کہا تھا کہ لا الہ الا اللہ پڑھنے والا کافر اور محمد رسول اللہ پڑھنے والا بھی کافر''۔ ہمارے سامنے ملفوظاتِ امیر ملت مرتبہ حاجی محمد عثمان حیدر آبادی مطبوعہ حیدر آباد دکن (بھارت) مئی ۱۹۵۰ء مطابق رجب ۱۳۶۹ھ کا نسخہ موجود ہے جس کے صفحہ ۶ تا ۸ پر یہی بحث ہے۔ ملاحظہ ہو:

''کلمہ شریف کے دو جز ہیں۔ جز اول توحید یعنی لا الہ الا اللہؐ۔ جز دوم رسالت محمدؐ رسول اللہؐ۔ ان دونوں جزوں میں کوئی فاصلہ نہیں ہے۔ جب لا الہ الا اللہؐ کی حد ختم ہوئی تو محمدؐ رسول اللہؐ کی ''م'' شروع ہوئی۔ فقط لا الہ الا اللہؐ پڑھا لیا، تو موحد بن گیا، مومن نہیں بنا۔ مومن کب بنے گا جب لا الہ الا اللہ محمدؐ رسول اللہؐ پڑھے گا۔
ہمارے لیے سب سے اعلیٰ اور سب سے افضل نعمت ایمان کی نعمت ہے۔ لا الہ الا اللہؐ تو شیطان بھی پڑھتا ہے۔ پھر اُس کو لعنتی کیوں کہتے ہو۔ شیطان کہتا ہے انی اخاف اللہؐ رب العالمین۔ جتنے فرقے دنیا میں ہیں سب توحید کے قائل ہیں۔ بھنگی ہوں یا چوہڑے، چمار، عیسائی ہوں یا کوئی اور۔ مگر سب ملعون ہیں، اس وجہ سے کہ وہ صرف لا الہ الا اللہؐ پڑھتے ہیں، محمدؐ رسول اللہؐ نہیں پڑھتے۔ کلمہ شریف کے ۲۴ حرف ہیں مگر کسی پر نقطہ نہیں۔ ۱۲ حرف جز اوّل لا الہ الا اللہؐ میں اور ۱۲ حرف جز دوم

محمدؐ رسول اللہؐ کے ہیں۔ ایمان میں دونوں جز برابر ہیں بلکہ جز دوم رسالت پہلے اور جز دوم توحید پیچھے۔ جب تک جز دوم پر ایمان نہ لائیں اس وقت تک جز اول کا قائل مسلمان نہیں ہوسکتا۔ بلکہ اس کا توحید پر بھی ایمان نہیں ہوسکتا۔ صرف محمدؐ رسول اللہؐ پڑھ لیا تو شرع کی رُو سے وہ مومن بن گیا۔ اس میں توحید بھی آ گئی اور رسالت بھی۔ ہماری نجات قیامت کے دن عملوں پر نہیں ایمان پر، اعتقاد پر ہے۔ سب سے پہلے اعتقاد پوچھا جائے گا پھر عملوں کا نسبت سوال کیا جائے گا۔

دنیا میں جو مومن ہے، وہ موحد ہے، پہلے موحد ہوگا تو پیچھے مومن بنے گا مگر ہر ایک موحد مومن نہیں بن سکتا۔

کلمہ شریف کے دو جز ہیں، پرندے کے دو پر کی طرح۔ پرندہ کا ایک پر ٹوٹ جائے تو وہ ایک پر سے بالشت بھر اڑ نہیں سکتا۔ جب تک اُس کے دونوں پر صحیح سلامت نہ ہوں۔ ایسا ہی ہمارا کلمہ شریف بارگاہ الٰہیؑ میں نہیں پہنچ سکتا جب تک اُس کے دونوں پر یعنی دونوں جز توحید و رسالت صحیح وسالم نہ ہوں''۔

☆

علاوہ ازیں حضرت امیر ملتؒ کے یہ ارشادات مبارکہ ہفت روزہ ''الفقیہہ'' امرتسر بابت ۷ تا ۱۴ ستمبر ۱۹۴۳ء صفحہ ۹، ۱۰، سیرت امیر ملت صفحہ ۶۳۹ ''ملفوظات امیر ملت'' مطبوعہ مکتبہ انوار الصوفیہ قصور جون ۱۹۶۵ء صفحہ ۱۰ تا ۱۲ اور ملفوظات امیر ملت مطبوعہ مدرسہ جماعتیہ حیات القرآن بازار پاپڑ منڈی لاہور مئی ۱۹۷۶ء صفحہ ۲۹، ۳۱ کی زینت بنے ہوئے ہیں، جن سے استفادہ کیا جا سکتا ہے۔

☆

اب قارئین کرام سے گزارش ہے کہ وہ مہاراجہ کے الزامات اور حضرت امیر ملتؒ کے

افکار ونظریات پر ایک منصفانہ نظر ڈالیں اور فیصلہ کریں کہ مہاراجہ نے اقبال کی حمایت حاصل کرنے کے لیے حقائق کو کس بیدردی سے توڑ مروڑ کر پیش کیا اور حضرت علامہ کی ہمدردی حاصل کرنے میں کامیاب ہوئے۔

آخر میں ہم مہاراجہ کے ''خاندان''، ''عقائد اور کردار'' کے بارے میں چند حوالے نقل کر کے کتاب ختم کرتے ہیں اور فیصلہ قارئین کرام پر چھوڑتے ہیں۔

محمد عبداللہ قریشی اپنی کتاب ''اقبال بنام شاد'' مطبوعہ لاہور ۱۹۸۶ء کے صفحہ ۴ پر رقمطراز ہیں:

''مہاراجہ ایک ایسے ''کھتری خاندان'' سے تعلق رکھتے تھے، جس نے عہد مغلیہ میں راجہ ٹوڈرمل اور عہد آصفیہ میں مہاراجہ چندولال جیسی عظیم شخصیتیں پیدا کیں''۔

صفحہ ۷ پر لکھتے ہیں:

''۱۹۳۷ء تک مہاراجہ حیدرآباد کے سیاہ وسفید کے مالک رہے اور غرّہ ربیع الثانی ۱۳۵۹ھ (۹ مئی ۱۹۴۰ء) کو آپ نے انتقال کیا۔ میت کے جلوس میں ہزاروں آدمی شریک ہوئے۔ ساری ریاست میں سوگ منایا گیا اور پرانے پل کے دروازے کے داہنی جانب ندی کنارے مہاراجہ چندولال (جد اعلیٰ مہاراجہ کشن پرشاد) اور مہاراجہ نریندر پرشاد (مہاراجہ کرشن پرشاد کے نانا) کے درمیانی حصے میں سمادھ بنائی گئی۔

مہاراجہ کا ماحول امیرانہ اور عادات فقیرانہ تھیں۔ گھر سے باہر نکلتے تو سکے بکھیرتے جاتے۔ ''بچوں والے'' راجہ پکارے جاتے تھے۔ ہولی میں ''کرشن کنھیا'' بنے رہتے تھے۔ شباب کی ترنگ میں غوثیہ بیگم کو جان پر کھیل کر اور عزت وآبرو کو بالائے طاق رکھ کر آغوش محبت میں اڑا لائے تھے اور ختنہ بھی کرا لیا تھا۔ بامسلماں اللہ اللہ، بابرہمن رام رام، کا

صوفیانہ مشرب رکھتے تھے۔ مندروں میں قشقہ لگاتے، مسجدوں میں نماز پڑھتے، مجالس عزا میں اشک بہاتے اور حال و قال کی محفلوں میں سر دھنتے تھے۔ نعتیں، منقبتیں، سلام اور مرثیے لکھ کر انہوں نے اپنی ''عقیدت وارادات'' اور دلگدازی کا ثبوت دیا ''جلوہ کرشن'' میں بانسری کے نغمے سنائے، جب ہی انہوں نے اپنا مواحدانہ مسلک یہ بیان کیا ہے:

میں ہوں ہندو میں ہوں مسلماں
ہر مذہب ہے میرا ایماں
شاد کا مذہب شاد ہی جانے
آزادی آزاد ہی جانے

صفحہ ۱۳ پر انکشاف فرماتے ہیں:

''مہاراجہ کی تین رانیاں اور چار بیگمیں تھیں۔ ہندو رانیوں کی اولاد ہندو اور مسلمان بیگمات کی اولاد مسلمان تھی۔ اسی مناسبت سے اُن کی شادیاں کی گئیں اور رشتے جوڑے گئے۔''

☆

اِحقاقِ حق وابطالِ باطل

(ازقلم حقیقت رقم مولانا محمد ذاکرالحسن حیدری مدظلہ، لاہور)

اللہ کریم جلّ جلالہ قرآنِ حکیم، فرقانِ حمید میں ارشاد فرماتے ہیں:۔

۱۔ اُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ الۡجَنَّۃِ ۚ ہُمۡ فِیۡہَا خٰلِدُوۡنَ

(پارہ ۱۔ سورہ البقرہ: ۸۲)

(''وہ جنت والے ہیں، اُنہیں ہمیشہ اُس میں رہنا ہے'')۔

۲۔ فَاتَّقُوا اللّٰہَ یٰۤاُولِی الۡاَلۡبَابِ لَعَلَّکُمۡ تُفۡلِحُوۡنَ

(پارہ ۷۔ سورہ المائدہ: ۱۰۰)

(''اے عقل سلیم والو! تم اللہ تعالیٰ جل شانہٗ سے ڈرتے رہو تا کہ تم فلاح پاؤ'')۔

۳۔ وَمَنۡ یُّطِعِ اللّٰہَ وَالرَّسُوۡلَ فَاُولٰٓئِکَ مَعَ الَّذِیۡنَ اَنۡعَمَ اللّٰہُ عَلَیۡہِمۡ مِّنَ النَّبِیّٖنَ وَالصِّدِّیۡقِیۡنَ وَالشُّہَدَآءِ وَالصّٰلِحِیۡنَ ۚ وَحَسُنَ اُولٰٓئِکَ رَفِیۡقًا ؕ (پارہ ۵۔ سورہ النساء: ۶۹)

(''اور جو اللہ ج اور اس کے رسولؐ کا حکم مانے تو اسے ان کا ساتھ ملے گا جن پر اللہ ج نے فضل کیا یعنی انبیاء اور صدیق اور شہید اور نیک لوگ، یہ کیا ہی اچھے ساتھی ہیں'')۔

۴۔ اِنَّ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ سَیَجۡعَلُ لَہُمُ الرَّحۡمٰنُ وُدًّا (پارہ ۱۶۔ سورہ مریم: ۹۶)

(''جو لوگ ایمان لائے اور انہوں نے نیک عمل کئے، اللہ تعالیٰ جل شانہ لوگوں کے دلوں میں ان کی محبت پیدا کر دیتا ہے'')۔

۵۔ اَلَآ اِنَّ اَوْلِیَآءَ اللّٰہِ لَا خَوْفٌ عَلَیْہِمْ وَلَا ہُمْ یَحْزَنُوْنَ

(پارہ ۱۱۔ سورہ یونس: ۶۲)

(''سن لو! بے شک اللہ کے ولیوں پر نہ کچھ خوف ہے نہ کچھ غم'')۔

۶۔ یَوْمَ لَا یَنْفَعُ مَالٌ وَّلَا بَنُوْنَ ط اِلَّا مَنْ اَتَی اللّٰہَ بِقَلْبٍ سَلِیْمٍ (پارہ ۱۹۔ سورہ الشعراء: ۸۸، ۸۹)

(''جس دن نہ مال کام آئے گا نہ بیٹے۔ مگر وہ جو اللہ کریم کے حضور سلامت (صحت مند، حسین و مطمئن) دل لے کر آئے گا'')۔

۷۔ وَالَّذِیْنَ جَاھَدُوْا فِیْنَا لَنَھْدِیَنَّھُمْ سُبُلَنَا ط

(پارہ ۲۱۔ سورہ عنکبوت: ۶۹)

(''جو لوگ ہماری اطاعت اور ہمارے دین میں مجاہدہ کرتے ہیں، ہم ان پر ہدایت کی خاص راہیں کھول دیتے ہیں'')۔

۸۔ اِنَّمَا یَخْشَی اللّٰہَ مِنْ عِبَادِہِ الْعُلَمٰٓؤُا ط (پارہ ۲۲۔ سورہ فاطر: ۲۸)

(''اللہ جل شانہ سے اس کے بندوں میں سے وہی ڈرتے ہیں جو اہل علم ہیں'')۔

۹۔ اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّ نَھَرٍ (پارہ ۲۷۔ سورہ القمر: ۵۴)

(''متقی لوگ باغوں اور نہروں کے درمیان زندگی بسر کریں گے'')۔

۱۰۔ اُولٰٓئِکَ کَتَبَ فِیْ قُلُوْبِہِمُ الْاِیْمَانَ (پارہ ۲۸۔ سورہ المجادلہ: ۲۲)

(''یہ (وہ لوگ) ہیں جن کے دلوں میں اللہ کریم جل شانہ نے ایمان نقش فرما دیا'')۔

۱۱۔ وُجُوْہٌ یَّوْمَئِذٍ نَّاضِرَۃٌ اِلٰی رَبِّھَا نَاظِرَۃٌ (پارہ ۲۹۔ سورہ القیامہ: ۲۲، ۲۳)

(''کئی چہرے اس روز تر و تازہ اور روشن ہوں گے، اور اپنے رب جل شانہ کے انوارِ جمال کی طرف دیکھ رہے ہوں گے'')۔

۱۲۔ قَدْ اَفْلَحَ مَنْ تَزَكّٰى ۙ (پارہ ۳۰۔سورہ الاعلیٰ:۱۴)

(''بے شک مراد کو پہنچا جو ستھرا ہوا یعنی تزکیہ نفس اختیار کیا'')۔

۱۳۔ یٰۤاَیَّتُهَا النَّفْسُ الْمُطْمَئِنَّةُ ارْجِعِیْۤ اِلٰى رَبِّكِ رَاضِیَةً مَّرْضِیَّةً فَادْخُلِیْ فِیْ عِبٰدِیْ وَادْخُلِیْ جَنَّتِیْ

(پارہ ۳۰۔سورہ الفجر:۲۷ تا ۳۰)

(''اے مطمئن نفس! اپنے پروردگار و مالک کے پاس لوٹ آ (اس لیے کہ دنیا میں بھی تو میری طرف ہی رجوع کرنے والا تھا) تو نے اس سے خوش، وہ تجھ سے خوش۔ تو میرے (اہل تسلیم و رضا) بندوں میں شامل ہو جا اور میری جنّت میں داخل ہو جا'')۔

☆

حدیث قدسی میں ارشاد خداوندی ہے کہ:۔

☆ ''جس نے میرے ولی سے دشمنی کی پس تحقیق اس نے مجھے دعوتِ مبارزت دی۔''
(بخاری شریف)

حضور سیّد عالم صلی اللہ علیہ وآلہٖ وسلم فرماتے ہیں۔

۱۔ ''تم میں سے بہترین لوگ وہ ہیں جن کو دیکھ کر خدا یاد آ جائے۔''
(سنن ابن ماجہ)

۲۔ ''مومن کی فراست سے ڈرو کیونکہ وہ اللہ (جل شانہ) کے نُور سے دیکھتا ہے۔'' (ترمذی شریف)

۳۔ ''کتنے ہی پراگندہ غبار آلود بالوں والا جس کو دروازوں سے اٹھا دیا جاتا ہے اگر وہ بندہ (اللہ جل جلالہ) پر قسم ڈالے تو وہ ضرور پوری

کر دے۔'' (صحیح مسلم)

۴۔ بلاشبہ بندگان خدا (جل جلالہ) میں سے کچھ بندے ایسے ہیں جن پر انبیاء اور شہداء غبطہ (رشک) کرتے ہیں۔

صحابہ کرامؓ نے عرض کیا، یا رسول اللہ! ہمیں ان کی پہچان بتایئے تاکہ ان سے محبت قائم رکھیں۔ نطق نبوی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے ارشاد ہوا۔

''یہ وہ لوگ ہیں جو مال و محنت کے بغیر صرف ذات الٰہی سے محبت رکھتے ہیں۔ ان کے چہرے نور کے میناروں پر روشن و تاباں ہیں۔ لوگوں کے خوف کے وقت یہ بے خوف اور ان کے غموں کے وقت یہ بے غم ہیں۔ پھر آپ نے یہ آیت مبارکہ تلاوت فرمائی کہ ''بیشک اللہ کے اولیاء وہ ہیں جن پر نہ خوف ہے اور نہ حزن و ملال''۔

(ابو داؤد شریف)

☆ ''عارفین باللہ کے دل رحمٰن (جل جلالہ) کی انگلیوں میں سے دو انگلیوں کے درمیان ہیں، وہ جسے چاہتا ہے انہیں الٹتا پلٹتا اور پھیرتا رہتا ہے (اپنی شانِ قدرت کے مطابق)۔ (تفسیر چرخی)

حضرت خواجہ یعقوب چرخی رحمتہ اللہ علیہ کا ارشاد ہے:۔

''پیغمبر اور انبیاء، رُسل ملائکہ سے افضل و برتر ہیں اور رسل ملائکہ کو عام آدمیوں پر فضیلت حاصل ہے اور مومنین صالحین عام ملائکہ سے افضل و برتر ہیں۔''

دلیل اس کی یہ آیت ہے:۔

جَزَآءُهُمْ عِنْدَ رَبِّهِمْ جَنّٰتُ عَدْنٍ تَجْرِيْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ خٰلِدِيْنَ فِيْهَآ اَبَدًا ط رَضِيَ اللّٰهُ عَنْهُمْ وَ رَضُوْا عَنْهُ ط ذٰلِكَ لِمَنْ خَشِيَ رَبَّهٗ (پارہ ۳۰۔ سورہ ''البینۃ'': ۸)

(ان کا صلہ ان کے ربؒ کے پاس بسنے کے باغ ہیں، جن کے
نیچے نہریں بہیں، ان میں ہمیشہ رہیں، اللہ (جل شانہ) ان سے
راضی اور وہ اس سے راضی، یہ اس کے لیے ہے جو اپنے ربؒ سے
ڈرے)۔

کیونکہ یہی نفوس قدسیہ فخرِ روزگار ہیں اور انسانیت کی آبرو ہیں، کائنات کی کوئی چیز ان کی ہمسری کا دعویٰ نہیں کر سکتی۔ ان کا دل پاک، نگاہیں پاک، نیت پاک، عزم بلند، شوق فراواں اور منزل اونچی کہ نوری فرشتہ بھی وہاں پر دم نہیں مار سکتا۔'' (تفسیر چرخی مطبوعہ ضیاء القرآن پبلی کیشنز، لاہور صفحہ ۲۵۸)

☆

☆ حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا قول مبارک ہے:۔
''اولیاء اللہ کے سینے اسرار الٰہی کے مدفن ہیں''۔
حضرت خواجہ یعقوب چرخی کا ارشاد ہے:۔

(۱) ''تو دوستانِ حق تعالیٰؒ کے ساتھ دوستی کر، مال و جاہ و مرتبہ کے لیے اُن سے دشمنی نہ کر کہ کہیں تو ان لوگوں کے انوارِ باطن کے فیوضات سے محروم نہ ہو جائے۔''

(۲) ''دشمنانِ اولیائے حق سے دور رہ، اُن کی صحبت میں نہ رہ کر ان کے انکار و کفر کی بدبختی سے تیرا اقرار کہیں نقصان پذیر نہ ہو جائے۔''

خاکساران جہاں را بحقارت منگر
تو چہ دانی دریں گرد سوارے باشد''

☆ قول محققین ہے:
''اللہ تعالیٰ (جل شانہ) کی صحبت و سنگت و معیت اختیار کرو، اگر
یہ نہیں کر سکتے تو اللہ (جل جلالہ) والوں کی صحبت و معیت اختیار کر
لو''۔

امام ربانی قندیل نورانی حضرت مجدد الف ثانی قدس سرہ النورانی ارشاد فرماتے ہیں:۔

''اولیاء اللہ کی نظر دوا ہے اور کلام شفا ہے اور محبت سراپا نور''۔

حضرت محمد بن سالم رحمۃ اللہ علیہ کے بقول:۔

''اولیاء اللہ کی علامات یہ ہیں: ''لطفِ لسان''، ''حسنِ اخلاق''، ''بشاشتِ چہرہ''، ''سخاوت نفس''، ''قلتِ اعتراضات''، ''عذر خواہ کے عذر کو قبول کرنا''، تمام مخلوق پر شفقت کرنا خواہ نیکوکار ہوں یا بدکار''۔

حضرت سید محمد جمال اللہ رامپوری علیہ الرحمہ کا ارشاد ہے:۔

''صحبت اولیاء سے وہ فوائد ملتے ہیں جو کتابوں کے انبار سے نہیں ملتے''۔

ایک مفکر کا قول ہے:۔

''اولیاء اللہ وہ نفوس مطمئنہ ہوتے ہیں جن کو اپنا غم نہیں ہوتا بلکہ ان اللہ تعالیٰ (جل شانہ) کے بندوں کا غم ہوتا ہے۔ وہ لوگ مومن، متقی اور اہل عشق و وفا بندے ہوتے ہیں جن کے دم قدم سے اسلام میں بہاریں، معاشرے میں سکون اور زہد و تقویٰ میں استحکام ہوتا ہے''۔

آیات قرآنی، احادیث مبارکہ اور بزرگان دین کے اقوال و ملفوظات، آپ نے مومنین، صالحین، متقین، نفوسِ قدسیۂ دوستانِ حق اور ''اولیاء اللہ'' کے بارے میں ملاحظہ فرمائے۔ ''اولیا اللہ'' وہ ہیں کہ جن کے ایمان کامل اور اعمال صالح سے اُن کے قلوب میں طمانیت و سکینت پیدا ہوتی ہے اور یہ معیار ہے خیر و حسنہ کا، لہٰذا نفس مطمئنہ یا مطمئن انسان ہی جنت میں جائے گا۔ (الفجر ۲۷۔۳۰) ان آیات میں رب ذوالجلال نے اپنے مطمئن بندوں کی صحبت و رفاقت کو جنت کے داخلے پر مقدم رکھ کر یہ جتایا ہے کہ انسان کی قدر و قیمت

جنت سے کہیں زیادہ ہے، اور نفوسِ مطمئنہ کی رفاقت وصحبت، جنّت سے افضل و اعلیٰ ہے، کیونکہ وہی جنت کی رونق ہوں گے اور ان کی صحبت ہی میں جنّت کی نعمتوں سے حقیقی لذّت و مسرت ملے گی اور خوب ملے گی۔

قرآن حکیم کی رُو سے نفوس مطمئنہ کی چار اصناف ہیں اور وہ اللہ تعالیٰ جل شانہ کے انعام یافتہ ہیں: ''انبیاء'' ''صدیقین''، ''شہدا'' اور ''صالحین'' (النساء: ۶۹)

اور قرآن مجید کی رو سے یہی چاروں گروہ ''اولیا اللہ'' ہیں اور اُن کی ایک پہچان یہ ہے کہ وہ خوف وحزن، رنج وغم اور درد والم سے محفوظ و مصئون حیات طیبہ بسر کرتے ہیں۔ (سورۃ یونس: ۶۲)

☆

جب ذاتِ حق کسی بندے کو اپنے انعام سے نوازتی ہے تو دیگر مخلوق کا میلان بھی اُسی طرف کر دیتی ہے اور اُسے زمین و آسمان میں قبول عام نصیب ہوتا ہے (سورۃ مریم: ۹۶) اور اُس انعام یافتہ بندے سے تعلق و مصاحبت کی راہ ہی بندگان خداؑ کے لیے صراط مستقیم قرار پاتی ہے۔

حضور سیّد عالم ﷺ (فداہ امی وابی) کے اس ارشاد گرامی کو حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ نے یُوں روایت کیا ہے:

> ''جب اللہ تعالیٰؑ کسی بندے سے محبت رکھتے ہیں تو جبریل علیہ السلام کو بلا کر فرماتے ہیں کہ میں فلاں سے محبت کرتا ہوں تُو بھی اس سے محبت کر۔ پس جبرئیل بھی اُس سے محبت کرنے لگتا ہے۔ پھر وہ آسمان میں ندا کرتا ہے اور کہتا ہے کہ فلاں شخص سے اللہ تعالیٰؑ محبت کرتے ہیں تم بھی اُس سے محبت کرو۔ پس اہل آسمان اُس سے محبت کرنے لگتے ہیں۔ پھر اس شخص کے لیے اہل زمین کے دل میں محبت اور مقبولیت ڈال دی جاتی ہے۔''

اس حدیث شریف سے معلوم ہوا کہ مومنین، صالحین اور اولیائے کاملین کی مقبولیت عامہ اُن کی محبوبیت کی دلیل ہے۔ چنانچہ جس شخص پر اللہ تعالیٰ (جل شانہ) کا انعام ہوتا ہے وہ صرف خدا (عزوجل) کا ہی نہیں بلکہ مقبول انام بھی ہو جاتا ہے تاکہ لوگ اُس سے رغبت رکھیں، اُس سے وابستہ ہوں اور وہ بھی اُس کی مصاحبت کی برکت سے خداوند تعالیٰ جل جلالہ کے انعام کے مستحق بن جائیں۔

اسی جماعت کو تاریخ اسلام میں ''اولیا اللہ''، مشائخ عظام'' اور صوفیائے کرام'' کے نام سے یاد کیا جاتا ہے۔ صالحین، متقین، اخیار، ابرار اور اہل محبت کا یہی گروہ ہے جو اللہ تعالیٰ کا انعام یافتہ ہے۔ یہی وہ لوگ ہیں جو صحابہ کرامؓ کے مسند رشد و ہدایت پر فائز ہوئے اور تعلیم کتاب و حکمت اور تزکیہ نفس کا مقدس فریضہ انجام دیا۔ لاریب سنوسیٔ ہند قبلہ عالم اعلیٰ حضرت امیر ملت حضرت پیر سیّد جماعت علی شاہ محدث یگانہ علی پوری رحمتہ اللہ علیہ کا شمار بھی اسی جماعت، اسی گروہ اور اسی حلقہ میں ہوتا ہے۔

یہ اُس کی دین ہے جس کو پروردگار دے

☆

ایک مورخ جب برصغیر پاک و ہند کی مذہبی، سیاسی اور روحانی تاریخ صفحہ قرطاس پر رقم کرنے کے لیے اپنے موئے قلم کو حرکت میں لائے گا تو اُسے حضرت امیر ملت قدس سرہ العزیز کے نام نامی اسم گرامی کو اپنے تاریخی شاہکار کا عنوان بنانا ہوگا کیونکہ اس بطل جلیل کی عالی ہمتی اور مساعی جمیلہ کی بدولت برصغیر میں دین اسلام کو حیات نو، تصوف و روحانیت کو طاقت اور تمام مذہبی و ملی تحریکوں کو جلا ملی۔ تحریک پاکستان انہی کے طفیل پروان چڑھی اور ۱۴ اگست ۱۹۴۷ء کو ہمیں سورج سے بھی روشن منزل پاکستان کی شکل میں ملی۔ آج جو کچھ بھی مذہب و تصوف کے بازار میں رونق اور گہما گہمی نظر آ رہی ہے، یہ حضرت امیر ملتؒ کی جان سپاریوں اور ہمت افروزیوں کا ہی صدقہ ہے۔ اگر یہ ہستی کفر و الحاد، انگریز، ہندو اور نام نہاد مسلمان سیاسی آمروں اور بازیگروں کی غاصبانہ یلغار کے سامنے سینہ سپر نہ ہوتی تو آج خاکم

ذہن اس ملک میں مذہب، تصوف اور روحانیت کی بساط الٹ چکی ہوتی اور اس کا کوئی نام لیوا بھی نہ ہوتا۔ جیسا کہ حضرت خطیب اسلام صاحبزادہ سیّد فیض الحسن شاہ سجادہ نشین آلومہار شریف ضلع سیالکوٹ نے حضرت امیر ملّت علیہ الرحمہ کی تقریب چہلم شریف پر ۷؍ اکتوبر ۱۹۵۱ء بروز اتوار خطاب کرتے ہوئے فرمایا تھا۔

''حضرت امیر ملّت قبلہ عالم رحمتہ اللہ علیہ کی نوجوانی کے زمانے میں تمام ملک ہندوستان میں کفر وظلمت کا دور دورہ تھا اور اسلام کو کسی ایسی اولوالعزم ہستی کا انتظار تھا، جو تاریکیوں کو مٹا کر نور ایمان سے دلوں کو روشن کر دے۔ کفر و الحاد کا عقاب ہر طرف شکار کی تلاش میں گرم پرواز تھا اور ڈرے سہمے کلمہ گو گوشہ نشینی میں عافیت سمجھ رہے تھے۔ اگر ایمان کی بجلی کبھی گمراہی کے تاریک پردوں کو چاک کرتی تو اپنی شپرہ چشمی کی بنا پر خلقت اس روشنی سے فیض پانے سے محروم رہتی۔ عوام الناس عادات و اخلاق اور اعمال و افعال کے لحاظ سے کفر میں ایسے رنگے ہوئے تھے کہ اسی شان و امتیاز سے یکسر بیگانہ تھے۔ غیر اسلامی رسوم وشعائر کو دین و ایمان سمجھ بیٹھے تھے اور صبغتہ اللہ کے خداوندی رنگ کا ان کو احساس ہی نہ رہا تھا۔ کافرانہ رواج اس قدر عام تھے کہ بیچاروں کو خدا (جل شانہ) اور رسول ﷺ کی تعلیمات سے یکسر بیگانگی تھی۔ کفر وشرک کے پجاری رُشد وہدایت سے نبرد آزما تھے اور ہندوستان سے اسلام کا نام مٹا دینے پر کمر بستہ۔ غرض پورا برصغیر شمال سے جنوب اور مشرق سے مغرب تک اسپین میں اسلام کے آخری دور سے مماثل نظر آتا تھا۔

ایسے وقت میں جب کہ روشیں ویران اور آبجوئیں خشک ہو چکی تھیں، کہ اچانک ابر

رحمت نمودار ہوا، گلزار عالم میں آثار حیات پیدا ہوئے۔ اس کا تقاطر بہار آفریں اور مردہ زمین کو حیات جاوداں بخشنے والا تھا۔ انسانیت کے پژمردہ چہرے پر رنگ شباب نکھرنے لگا۔ بادِ خزاں کے ہزیمت خوردہ درختوں کی عریاں شاخوں کو از سرِ نو خلعتِ برگ و بار عطا ہوا، کہ وہ آفتاب عالم تاب طلوع ہوا۔ اس نیر اعظم نے شب و روز سفر کی صعوبتیں برداشت کر کے، ان سرنگوں مسلمانوں کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر اُن کی بنیا و روشن کر دیا۔ اور اُن کے ظلمت کدوں میں پہنچ کر اُن کے تاریک ترین گوشوں کو منور و ضوفشاں کر دیا۔ ان سیاہ ذرّوں کو تابندہ ستارے بنا دیا۔ اپنی تمازت عالمتاب سے پژدہ دلوں کو گرمایا۔ اور تازہ خون پیدا کیا۔ خوابیدہ احباب کو جگایا اور ہوشیار کیا اور میدان عمل میں لا کھڑا کیا اور اُن سے کام لیا۔ حالانکہ اس وقت نہ کوئی واعظ تھا نہ وعظ سننے والا، نہ جلسہ تھا نہ جلوس، نہ انجمن تھی نہ کارکن، صرف حضرت امیر ملت قبلہ عالم رحمتہ اللہ علیہ ہی سب کچھ تھے اور آپ نے یکہ وتنہا اصلاح دین کا بیڑا اٹھایا تھا''۔

☆

اہل اللہؒ کا وجود ہی تبلیغ کا نشان ہوتا ہے، اُن کی زندگی کا ہر عمل درس ہوتا ہے۔ اُن کی گفتگو اُن کے دینی کردار، روحانی کیفیات اور قلبی واردات کا حصہ ہوتی ہے، اس میں ازلی صداقت اور حقیقت ہوتی ہے۔ اُن کی گفتگو کا ہر لفظ اُن کے مجاہدات و ریاضت کا نچوڑ ہوتا ہے۔ حضرت امیر ملت علیہ الرحمہ کی گفتگو بھی یہی تاثیر رکھتی تھی۔ اُن کی گفتگو کا ہر لفظ دل میں ایمان کی شمعیں روشن کرتا چلا جاتا تھا۔

بہ سُوئے علی پور رو دنیا و دیں خواہی
غلامِ امیر ملت شوا گر حق الیقیں خواہی

حضرت امیر ملت رحمتہ اللہ علیہ کی شخصیت ہفت پہلو ہیرے کی طرح تھی۔ جیسا کہ نامور صحافی، معروف دانشور اور ممتاز ادیب صاحبزادہ سید خورشید احمد گیلانی مرحوم اپنی کتاب مستطاب ''ہفت رنگ ہیرا'' مطبوعہ ۱۹۹۹ء صفحہ ۹ پر لکھتے ہیں۔

''جس طرح کسی ہفت رنگ ہیرے کو سورج کے سامنے کیا جائے اور بدل بدل کر اُس کا ہر کونہ شعاعوں کے برابر لایا جائے تو یہ ہر رنگ اپنی بہار دکھاتا ہے۔ کہیں سے ارغوانی، کہیں سے عنابی، کہیں سے سنہری، کہیں سے ازقونی، کہیں سے حنائی، کہیں سے بلوریں اور کہیں سے احمریں عکس جھلکتا ہے۔ اسی طرح اگر امیر ملّت حضرت پیر سیّد جماعت علی شاہ رحمتہ اللہ علیہ کی شخصیت اور خدمات کو وقائع و حوادث کے آئینے میں دیکھا جائے تو ہر زاویے سے نئی تصویر اُبھرتی ہے اور وہ تصویر بہت ہی دلکش اور نظر نواز ہے، کسی شخص کو تاریخ میں زندہ رکھنے کے لیے اس کا ایک ہی جاندار پہلو کافی ہوتا ہے، کوئی محدث ہو، کوئی مفسر ہو، کوئی متکلم ہو، کوئی خطیب ہو، کوئی ادیب ہو، کوئی فلسفی ہو، کوئی صوفی ہو، کوئی سپہ سالار ہو، کوئی شاعر ہو اور کوئی سیاسی رہنما ہو، بس ایک ہی میدان کا مرد ہونا اس کی شناخت کے لیے بہت ہے لیکن امیر ملّت کے ہاں اُن کی دائمی زندگی اور مستقل شناخت کے لیے اتنے پہلو ہیں کہ تاریخ جتنی بار نئی کروٹ لے اُس کی ہر کروٹ سے امیر ملّت ابھر کر سامنے آئیں گے، زمانہ جتنی مرتبہ گردش کھائے، ہر گردش سے امیرِ ملّت کی تصویر نکھر کر سامنے آ کھڑی ہوگی اور وقت چاہے جتنے پہلو بدلے، اُسے ہر پہلو سے امیر ملّت نیا جنم لیتے دکھائی دیں گے۔''

☆

اقبالؔ کے کلام میں خودی اور شاہین کے بعد سب سے زیادہ ذکر ''مردِ مومن'' ہی کا ہے۔ اقبالؔ نے اس کے لیے ''انسان کامل''، ''مردِ حق''، ''مردِ قلندر''، ''بندہ آفاقی''، ''بندہ مومن'' اور ''مردِ خدا'' کی اصطلاحات بھی استعمال کی ہیں۔ چنانچہ اُس نے اپنے ''مردِ مومن''

کی جو بنیادی خصوصیات دکھائی ہیں، وہ کچھ یوں ہیں:

(۱) وہ اللہ (جل جلالہ) کی ذات پر کامل ایمان کی بدولت، عزم واستقلال اور جرأت و ہمت کا حامل ہوتا ہے۔

(۲) اُس کے اخلاق وکردار قرآنی ہوتے ہیں اور اس کے کردار میں جلالی و جمالی دونوں صفات موجود ہوتی ہیں۔ وہ گفتار وکردار میں اللہ کی بُرہان ہوتا ہے۔

(۳) اقبالؒ کے نزدیک تمام عالم کی رہنمائی صرف ''مردمومن'' کو زیب دیتی ہے کہ اُسے پیدا ہی عالم کی حق کی جانب رہنمائی کے لیے کیا گیا ہے۔

(۴) ''مردمومن'' اپنے کردار میں اپنے اسلاف کا نمونہ ہوگا اور اللہ (عزوجل) کی سرزمین پر فقط اُسی کے احکام کے تابع ہوگا۔

(۵) اقبالؔ کے نزدیک ''مردمومن'' کا کوئی مخصوص وطن نہیں، چونکہ اُس نے خود کو خدا (عزوجل) کے لیے وقف کر دیا ہے، اس لیے خدا (عزوجل) نے بھی ساری کائنات کو اُس کے لیے وقف کر دیا ہے۔ اقبالؔ کے نزدیک ''مردمومن'' کی حیثیت ایک عالمی حقیقت ہے! رنگ ونسل اور ملک و وطن کی جغرافیائی حدود میں اسے پابند نہیں کیا جاسکتا۔

(۶) اقبالؔ کے ''مردمومن'' کی ایک صفت یہ بھی ہے کہ وہ ''صاحب فقر واستغناء'' ہوتا ہے اور اُس کی ذات کی تکمیل میں ''فقر'' ایک اہم کردار ادا کرتا ہے۔

(۷) ''مردمومن'' کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ وہ اپنے اعجازِ عمل سے تجدیدِ حیات کرتا ہے۔

(۸) ''مردمومن'' جرأت مند، حق گو اور بیباک ہوتا ہے، اُسے مال و دولت اور جاہ وحشم کی کشش اپنی طرف نہیں کھینچ سکتی کیونکہ مومن کے دل میں ''فقرِ غیور'' کی دولت بھری ہوتی ہے۔

(۹) ''فقر'' کی ایک بڑی خصوصیت ''غیرت'' ہے جو ایک طرح کی اقتصادی اور معاشی

خودداری ہے یاد رہے کہ ''فقرِ غیور'' ۔ ''گدایانہ فقر'' کا بالکل متضاد ہے۔

(۱۰) ''مردِ مومن'' کی ایک خصوصیت یہ ہوگی کہ وہ خوف کے ہر شائبے سے پاک ہوگا۔

☆

اقبالؔ کو جب یہ اوصاف اور یہ خصوصیات قبلہ عالم امیر ملت حضرت پیر سیّد جماعت علی شاہ محدّثِ یگانہ علی پوری رحمتہ اللہ علیہ کی ذات ستودہ صفات میں نظر آئیں تو وہ دل و جان سے اُن کے شیدائی ہو گئے اور بصد ادب و احترام دامن عقیدت تھام لیا، جیسا کہ کتاب ہذا کے باب اول سے عیاں و بیاں ہے۔ مگر حاسدین و معاندین اور ناقدین کو تو مخالفت کا کوئی بہانہ چاہیے ۔ اقبالؔ کی اس اس ارادت وعقیدت کے خلاف بھی سازش کے سرپٹ گھوڑے دوڑائے گئے جو تیسرے باب قضیہ مہاراجہ کشن پرشاد شادؔ میں تفصیل سے ملاحظہ کئے جا سکتے ہیں اور اس کتاب کی تشکیل و تکمیل کا مقصد وحید اور مطمحِ نظر ہی اس سازش کا پردہ چاک کرنا، اُسے خاسر و نامراد کرنا اور احقاقِ حق و ابطالِ باطل کا مظاہرہ کرنا ہے۔ اب فیصلہ قارئین کرام کے ہاتھوں میں ہے کہ ہمیں اس مقصد میں کہاں تک کامیابی و کامرانی حاصل ہوئی ہے۔ اہل علم کی آراء کا انتظار رہے گا۔

☆

یہ ایک عجیب معاملہ ہے کہ جتنی بڑی شخصیت ہوگی، اُس کی عظمت وسطوت کے مینار کو گرانے کے لیے اس کے خلاف اتنی ہی بڑی سازشیں ہوں گی، الزام تراشیوں کی بوچھاڑ ہوگی اور کردارکشی کے لیے زبردست مہم چلائی جائے گی۔ تحریری اور تقریری لحاظ سے بغض و عناد کی انتہاء کر دی جائے گی۔ چنانچہ حضرت امیر ملت رحمتہ اللہ علیہ کے خلاف بھی ایسا ہی ہوا۔ اقبالؔ اور امیر ملت کے خلاف سازش پر تو ہم کتاب ہذا میں تفصیلی بحث کر چکے ہیں ۔ ذیل میں چند ایسے ہی مزید واقعات و روایات اور اُن کی دلائل قاہرہ کے ساتھ تردید پیش خدمت ہے:۔

۱

ہمارے پیش نظر حضرت پیر سیّد مہر علی شاہ گولڑوی رحمتہ اللہ علیہ کی سوانح حیات ''مہر منیر'' تالیف جناب مولانا فیض احمد فیض طبع سوم ۱۹۷۶ء صفحہ ۴۰۶ ہے، جس میں لکھا گیا ہے کہ امیر ملّت حضرت پیر سیّد جماعت علی شاہ محدث پوری علیہ الرحمہ کو حضرت گولڑوی علیہ الرحمہ سے شرف تلمذ حاصل ہے۔ یہ بالکل بے سروپا اور حقیقت سے دور ہے یا یوں کہہ لیجئے کہ خلاف واقعہ ہے اور درست نہیں ہے۔ حضرت امیر ملّت کی ولادت باسعادت ۱۸۴۱ء ہے جب کہ حضرت گولڑوی علیہ الرحمہ ۱۸۵۹ء میں پیدا ہوئے۔ گویا حضرت گولڑوی بلحاظ عمر حضرت امیر ملّت سے اٹھارہ سال کم عمر ہیں اور پھر حضرت امیر ملّت ۱۸۶۱ء میں بعمر مبارک بیس سال جملہ علوم وفنون سے فراغت حاصل کر کے مسندِ رُشد و ہدایت پر فائز ہو چکے تھے۔ جب کہ حضرت گولڑوی ۱۸۷۸ء میں یعنی سترہ برس بعد فارغ التحصیل ہوئے۔ اب غور طلب امر یہ ہے کہ سترہ سال بعد میں فارغ ہونے والا استاد کیسے ہوسکتا ہے اور پھر لطف کی بات یہ ہے کہ جب حضرت گولڑوی فارغ التحصیل ہوئے تو حضرت امیر ملّت کے ہاں خلف اکبر سراج الملّت حضرت پیر سیّد حافظ محمد حسین شاہ علیہ الرحمہ متولا ہو چکے تھے لہٰذا سمجھ سے باہر ہے کہ حضرت امیر ملّت قدس سرہ العزیز، حضرت گولڑوی رحمتہ اللہ علیہ کے شاگرد کیسے ہوئے؟ ہاں یہ ضرور ہوسکتا ہے کہ حضرت گولڑوی نے حضرت امیر ملّت سے کسی مقام پر علمی استفادہ کیا ہو اور یہ بات بالکل قرین قیاس ہے۔

اپنے شیخ کی عزت بڑھانے کے لیے فرضی کہانیاں، قصے اور واقعات گھڑنا کوئی اچھی روایت نہیں ہے۔ ایسی خود ساختہ، بے مقصد اور بے فائدہ داستان گوئی سے پرہیز اور حذر ہی بہتر ہے ورنہ انتشار اور باہمی جنگ وجدل کے اندیشہ کا مقام ہوسکتا ہے۔ اس قصہ کی تردید ماہنامہ ''رضائے مصطفےٰ'' گوجرانوالہ بابت ماہ اگست ۲۰۰۹ء صفحہ ۲۲ اور ماہنامہ ''الہام'' بہاولپور بابت جولائی اگست ۲۰۰۹ء صفحہ ۴۴ پر بھی کی جا چکی ہے۔

۲

ششماہی مجلّہ ''تاریخ و ثقافت پاکستان'' (قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ و ثقافت پاکستان، اسلام آباد) جلد ۵ شمارہ ۲ (مسلسل شمارہ نمبر ۱۰) بابت اکتوبر ۱۹۹۴ء کے صفحہ ۵ تا ۳۴، جناب ڈاکٹر محمد خورشید اسسٹنٹ پروفیسر شعبہ تاریخ و پاکستانیات اسلامیہ یونیورسٹی بہاولپور کا مضمون ''تنازعہ مسجد شہید گنج'' (تجزیاتی مطالعہ) شائع ہوا ہے، جس میں صاحب مضمون نے ''مسجد شہید گنج کی ''تاریخ، تحریک اور انجام'' پر طویل بحث کی ہے۔ تحریک شہید گنج کے قائد اور پوری قوم کے باتفاق رائے منتخبہ ''امیر ملّت'' حضرت پیر سیّد جماعت علی شاہ محدث اعظم علی پوری علیہ الرحمہ کے علاوہ مولانا ظفر علی خاں، سیّد حبیب ایڈیٹر ''سیاست''، لاہور، نائب امیر ملّت مولانا محمد اسحاق مانسہروی اور قومی خادم میاں فیروز الدین احمد و دیگر کارکنان تحریک شہید گنج پر نہایت بے دردی کے ساتھ بے جا تنقید کے تیرونشتر برسائے ہیں کہ بقول اُن کے وہ تحریک کے ساتھ مخلص نہیں تھے، اہل نہیں تھے اور اُن کا کردار مشکوک تھا۔ وغیرہ وغیرہ۔

شاید ڈاکٹر صاحب کو اس بات کا ادراک نہیں ہے کہ باتیں کرنا بہت آسان ہے اور میدان عمل میں جان کی بازی لگانا بہت مشکل کام ہے۔ انگریز حکومت کے ساتھ ٹکر لینا کوئی آسان بات نہ تھی لیکن پھر بھی تمام قائدین و کارکنان تحریک شہید گنج نے اپنی تمام تر مسائی بروئے کار لا کر مسجد کی واگزاری کے لیے تن من دھن کی بازی لگا دی مگر شومئی قسمت کہ انگریز حکومت نے اس مسئلہ پر سکھوں کا ساتھ دے کر نہ صرف مسلمانوں کی حق تلفی کی، انصاف کا خون کیا بلکہ اسلام دشمنی کا بھی خوفناک مظاہرہ کیا۔ یہ نہایت ہی افسوسناک امر ہے کہ جن قومی خدمتگاروں نے اس تحریک میں بے پناہ قربانیاں دیں وہ ڈاکٹر صاحب کے ہاں معتوب ہیں اور جن لوگوں نے حصہ لینے سے پہلو تہی کی، گریز پار ہے بلکہ ڈٹ کر مخالفت کی وہ اُن کے ممدوح و محبوب ہیں۔ کیا ڈاکٹر صاحب کو اپنی ممدوح جماعت ''مجلس احرار'' کا بھیانک کردار نظر نہیں آیا؟ اگر ایسا ہے کہ تو پھر بطور سرمہ چشم اس حوالہ پر غور و فکر فرمانے کی زحمت گوارا کریں کہ ''تحفہ سعدیہ'' مطبوعہ لاہور جنوری ۱۹۷۹ء طبع دوم (ادارہ سعدیہ مجددیہ ۷۔ بیڈن روڈ

لاہور) کے مصنف مولانا محبوب الٰہی اپنی اس کتاب کے صفحہ ۱۱۸ پر ''اصل فتنہ کی نشاندہی'' کے زیرعنوان رقمطراز ہیں کہ:

''جن ایام میں مسجد شہید گنج '' کی تحریک زوروں پر تھی اور اہل اسلام میں ہر فرد ولولہ و جوش کا مرقع تھا، حضرت اعلیٰ نے مجلس احرار کو ایک گرامی نامہ تحریر فرمایا جس میں لکھا تھا کہ ''مسجد شہید گنج'' اگر مسلمانوں کے ہاتھ سے چلی جا رہی ہے تو اس کا غم نہ کریں، اللہ تعالیٰ (جل جلالہ) کے فضل و کرم سے مساجد پھر بھی تعمیر کی جا سکیں گی۔ ان کی حیثیت ہر حال میں ثانوی ہے۔ اسلام کے تحفظ و بقا کو اولین اہمیت حاصل ہے اور اصل فتنہ موجودہ دور میں مرزائیت کا ہے جو وجود اسلام کو مٹانا چاہتا ہے، اس کے خلاف جہاد جاری رکھنا چاہیے۔ اگر اسلام محفوظ رہا تو مساجد کی کمی نہ رہے گی۔ لہٰذا بقائے اسلام کی خاطر اپنی تمام کوشش و ہمت کو مبذول کرنا چاہیے۔

مولانا حبیب الرحمٰن صاحب لدھیانوی، حضرت عطاء اللہ صاحب بخاری اور دیگر اکابر احرار فرمایا کرتے تھے کہ حضرت عبدالقادر رائے پوری اور حضرت اعلیٰ مولانا احمد خان صاحب[1] وہ مبارک ہستیاں ہیں جنہوں نے مسجد شہید گنج کے سلسلہ میں ہمیں صحیح مشورے دیئے اور ہمیشہ ہماری حوصلہ افزائی فرمائی۔''

[1] مولانا ابوالسعد احمد خان سجادہ نشیں موسیٰ زئی شریف، ڈیرہ اسماعیل خان۔

میں اپنی طرف سے مذکورہ بالا حوالہ پر کچھ تبصرہ نہیں کرنا چاہتا۔ قارئین کرام خود ہی فیصلہ فرمائیں کہ مسجد جو آثار اسلام ہے، کافروں کے حوالے کرنے سے ہی اسلام کا تحفظ و بقا ہوتا ہے؟ ہائے افسوس کہ راہ فرار اختیار کرنے کی کیا انوکھی اور نرالی توجیح کی ہے۔ احرار کے اس کارنامے پر مولانا ظفر علی خاں نے اپنی کتاب ''چمنستان'' مطبوعہ لاہور ۱۹۴۴ء صفحہ ۱۰۴ پر فرمایا تھا ؎

میں نے مسجد نہیں بیچی کبھی تیری مانند
ابے او چندہ کے بھوکے ابے او دین فروش

صفحہ ۱۶۸ پر مزید ارشاد کرتے ہیں ؎

نرالی وضع کا مومن ہے طبقۂ احرار
کہ سر جھکا ہوا مشرک کے آستاں پر ہے
خدا کے گھر کی تباہی میں حصہ دار ہوئے
یہ ظلم انھوں نے کیا آپ اپنی جاں پر ہے

☆

ڈاکٹر محمد خورشید اپنے مضمون کے صفحہ ۳۰ پر حاشیہ نمبر ۳۸ کے تحت سر میاں فضل حسین کے حوالے سے لکھتے ہیں کہ:

''پیر جماعت علی شاہ علی پوری ایک انتہائی بااثر شخصیت تھے جنہیں پنجاب کے دیہاتی علاقوں میں مؤثر حیثیت حاصل تھی۔ آپ کے مرید نہ صرف بڑی تعداد میں تھے بلکہ بااثر بھی تھے۔ پہلی جنگ عظیم کی فتح یابی کے بعد گورنر پنجاب مائیکل اوڈائر (۱۹۴۰ء۔۱۸۶۴ء) کو جو سپاسنامہ پیش کیا گیا، اُس میں پیر صاحب کے دستخط بھی تھے۔ اُن کے تعویذ پہلی جنگ عظیم میں برطانوی فوج کے مسلمان سپاہیوں میں تقسیم ہوئے تھے کہ ان تعویذوں کی برکت سے اُن پر ترک گولی اثر نہیں کرے گی۔ اس کے باوجود عوام میں اس قدر مقبول تھے کہ جب پیر صاحب حصول مسجد شہید گنج کی تحریک کے لیے ''امیر ملت'' منتخب ہو کر لاہور پہنچے تو اُن کا فقید المثال استقبال کیا گیا اور جلوس نکالا گیا۔ راویوں کا بیان ہے کہ لاہور میں اتنا بڑا جلوس اس سے پہلے شاذ ہی دیکھا ہو۔''

(Diary and Notes of Mian Fazal-i-Husain,
Lahore, 1977. P.154)

مضمون نگار نے اُس شخص کی ڈائری کا حوالہ دیا ہے جو یونینسٹ تھا اور انگریز کا حاشیہ بردار۔ وہ شہید گنج کے معاملے میں حکومتی پالیسی کا حامی و موید تھا، وہ بھلا تحریک شہید گنج کی

قیادت کو کیسے برداشت کرسکتا تھا، اُس نے تو اپنے انگریز آقاؤں کو خوش کرنے کے لیے حضرت امیر ملت کی کردار کشی کا فریضہ انجام دینا ہی تھا۔ اس سلسلہ میں مضمون نگار صفحہ ۲۵ پر لکھتے ہیں:

''اُن کی جماعت نے کبھی بھی ایسے طریق کار کی حوصلہ افزائی نہ کی جس سے حکومت کی نظر میں وقار ختم ہو جائے یا عدم اعتماد کی فضا پیدا ہو۔ لہٰذا جب انتہائی قابل اعتماد یونینسٹوں نے شہید گنج تحریک کی مدد کی تو فضل حسین کو بڑی پریشانی لاحق ہوئی''۔

''یہ کہنا بے جا نہ ہوگا کہ یونینسٹ پارٹی نے اخلاقی یا سیاسی اعتبار سے مسجد شہید گنج کی بازیابی کے لیے کوئی مدد فراہم نہ کی۔ دراصل یہ پارٹی بڑے بڑے جاگیرداروں اور سجادہ نشینوں پر مشتمل تھی، جنہیں حکومت کی وفاداری کے عوض بے شمار مراعات حاصل تھیں لہٰذا عوامی پلیٹ فارم سے یا اسمبلی میں یہ طبقہ کسی ایسی تحریک کی تائید کرنے کے لیے تیار نہ تھا جو حکومت کی خواہش کے برعکس ہو''۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ جو شخص انگریز پرست، جاہ پرست اور مفاد پرست ہو اور مسجد شہید گنج کی آزادی کی تحریک کا مخالف ہو، حریت پسندی کا دشمن ہو اور جس کا دل و دماغ غلامی کا اسیر ہو وہ حضرت امیر ملت رحمتہ اللہ علیہ کی کردار کشی نہیں کرے گا تو کیا کرے گا اور مخالفت کی آتش سوزاں میں نہیں جلے گا تو کیا کرے گا اور پھر جس کا مقصد وحید اور مطمح نظر جاگیرداروں کا مفاد ہو وہ راہ حق کے مسافروں پر الزام تراشی نہیں کرے گا تو پھر کیا کرے گا۔ لیجئے! اس سلسلے میں ایک حوالہ ملاحظہ فرماتے جائیے اور سر میاں فضل حسین کے منفی کردار سے نفرت کا اظہار کرتے جائیے۔

جناب ندیم شفیق ملک اپنے ایم فل کے مقابلہ بعنوان ''علامہ اقبال کا خطبہء الہ آباد

۱۹۳۰ء ایک مطالعہ'' مطبوعہ فیروز سنز لاہور ۱۹۹۸ء صفحہ ۲۶ پر رقمطراز ہیں:

''پنجاب میں سر میاں فضل حسین (۱۸۷۷ء۔ ۱۹۳۶ء) نے ذاتی طور پر مسلمانوں کی معاشی و تعلیمی ترقی کی طرف کچھ توجہ دی مگر سیاسی میدان میں اُن کی قائم کردہ یونینسٹ پارٹی، مسلم قومیت کی بجائے ہندو مسلم جاگیرداروں کے اقتصادی مفادات کی ہی وکالت کرتی رہی۔''

بہر حال اب ہم سر میاں فضل حسین کے دونوں الزامات کا ترتیب وار جائزہ لیتے ہیں:

(۱) جہاں تک محضر نامہ پر دستخط کرنے کا تعلق ہے سو یہ بات بالکل غلط، لغو اور بے بنیاد ہے حضرت امیر ملّت نے ۳۔۴ مارچ ۱۹۲۱ء کو ڈسٹرکٹ خلافت کانفرنس لائل پور (حال فیصل آباد) کا صدارتی خطبہ ارشاد فرماتے ہوئے مولانا ظفر علی خاں، مولانا شوکت علی اور ہزاروں سامعین و حاضرین کی موجودگی میں ارشاد فرمایا:۔

☆ ''خدا (جل شانہ) کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ میں نے پنجاب کی فوج میں ایک متنفس کو بھی بھرتی نہیں کرایا۔ اڈوائر صاحب لیفٹیننٹ گورنر کو ایک محضر نامہ پیش کیا گیا، اس پر اکثر پیران عظام کے دستخط موجود ہیں، لیکن میرے دستخط ہرگز موجود نہیں۔ میں کبھی لاٹ صاحب کے پاس تک نہیں گیا۔ خدا (عزوجل) مجھے محفوظ رکھے! میں انشاءاللہ تعالیٰ کبھی کسی افسر کے پاس نہیں جاؤں گا۔ میں ''سیّد'' ہوں، آلِ رسول ﷺ ہوں، باایمان ہوں۔ مجھے خدا (جل شانہ) کے سوا کسی کا ڈر نہیں۔ مجھے خدا (جل جلالہ) کی رحمت کاملہ سے یقین ہے کہ میں اپنے ایمان اور اپنے اعمال کی بنا پر انشاء اللہ تعالیٰ سادات بابرکات کی صف میں اٹھایا جاؤں گا''۔

(سیرت امیر ملّت'' مطبوعہ علی پور سیّداں ۱۹۷۵ء ص ۵۹۲)

☆ ''مجھے سمرنا کے مظلومین سے، اپنے ترک بھائیوں سے ہمدردی ہے۔ بحمد اللہ میں مسلمان ہوں، باایمان ہوں، آل رسول ﷺ ہوں، حقیقی ''سیّد ہوں'' مجھے ترکوں سے محبت ہے، اپنے خلیفۃ المسلمین سے، اپنے سلطان معظم سے عقیدت ہے۔ میں اپنا آپ اور اپنا سب کچھ حضور سلطان المعظم اور خدمت اسلام کے لیے پیش کرنے کو تیار ہوں''۔ (ص ۵۹۰)

☆ ''میں نے سنا ہے کہ میری نسبت یہ کہا جاتا ہے کہ میں انگریزوں سے ڈرتا ہوں، میں اُن کا طرف دار ہوں۔ اب تم ہی بتاؤ کہ میں نے اُن کا کون سا خطاب قبول کیا؟ کون سی جاگیر حکومت سے حاصل کی؟ کون سا تمغہ یا سندلی ہے؟ میں ان دنیا والوں اور ان تمام دنیاوی چیزوں پر لعنت بھیجتا ہوں۔ مجھے انگریزوں سے کیسا ڈر! کیسا خطر! ڈرے وہ جسے دنیا اور دنیا کی چیزوں کا خیال ہو۔ عزت و دولت دینے والا میرا خدائے پاک ہے، میرا مولا ہے۔ مجھے انگریزوں کی خوشامد سے کیا نسبت!! میں مسلمان ہوں، مسلمان کے گھر پیدا ہوا ہوں اور انشا اللہ مسلمان ہی مروں گا۔ میرا اٹھنا، میرا بیٹھنا، میرا چلنا، میرا کھانا، میرا پینا، میرا سونا، غرضیکہ میری ہر ایک بات خدا (جل جلالہ) اور محض خدا (جل شانہ کے لیے ہے، میں دنیا اور دنیاوی باتوں کے لیے ہرگز ہرگز کچھ نہیں کرتا''۔ (ص ۵۹۱)

(ii) جہاں تک ترکوں کے خلاف انگریزوں کی تائید وحمایت کا تعلق ہے اس سلسلہ میں آپ نے فرمایا کہ:

''میں بیان کر رہا تھا کہ محبت کا نام ایمان ہے۔ اس کے کمال پر

کمال ایمان کا انحصار ہے۔ مسلمانو! غور تو کرو۔ تم مسلمان خاندانوں میں پیدا ہوئے۔ مسلمانوں کے سے نام رکھے، مرنے کے بعد مسلمانوں کے قبرستان میں دفن ہوتے ہو۔ اور حال یہ ہے کہ مسلمانوں کی قبریں پلید کرتے ہو، اپنے بھائیوں پر گولیاں چلاتے ہو، تمہیں شرم نہیں آتی؟ لعنت ہے اللہ (جل جلالہ) اُس شخص پر جو غیروں کو غلام بنائے، چہ جائیکہ اپنے بھائی پر گولی چلا کر اُسے شہید کرے، اور اس کے ملک، اُس کے خاندان، اُس کے ننگ و ناموس کو اعدائے اسلام کے حوالے کر دے"۔ (صفحہ ۵۹۲)

"بنی آدم تو ایک طرف رہے، ہمارے بھائیوں کو، ہمارے ترک اور عرب بھائیوں کو تکلیف پہنچے، اُن کو مصیبتوں کا سامنا کرنا پڑے، وہ دکھ اٹھائیں، اور ہم بیٹھے دیکھا کریں۔ ہم کس طرح مسلمان کہلائے جا سکتے ہیں؟ کیا ہندوستان میں شوکت علی اور محمد علی ہی رہ گئے ہیں جو ہر ایک مسلمان کے لیے تکلیفیں اٹھائیں، جیل خانوں میں جائیں؟ کیا باقی مسلمان مر گئے؟ تم میں غیرت نہیں، تم میں حمیّت نہیں۔ حضرت رسول پاک ﷺ فرماتے ہیں کہ "جس میں غیرت نہیں، اس میں ایمان نہیں"۔ تمہیں معلوم ہے کہ محمد علی (مولانا محمد علی) نے قید کی تکلیف کیوں برداشت کی؟ محض اس لیے کہ انہوں نے انگریزوں کو مخاطب کر کے لکھ دیا تھا کہ تم "مصر چھوڑ دو" اور یہ کہ "ترکی شریک جنگ ہونے میں حق بجانب تھا"۔ تم ہی بتاؤ کہ یہ کون سا جرم ہے؟ ہر ایک مسلمان بشرطیکہ وہ واقعی مسلمان ہو، یہی کہے گا کہ یہ کوئی جرم نہیں۔ تو پھر محمد علی کا جرم کیا ہے؟

ہم سے پوچھا جاتا ہے کہ سلطان المعظم سے تمہارا کیا تعلق ہے؟ تم ہندوستان میں پیدا ہوئے یہیں پرورش پائی، اسی ملک میں جواں اور بوڑھے ہوئے۔ کیا ان لوگوں کو یہ معلوم نہیں؟ کیا یہ بات اب تک راز ہے؟ کہ حضرت سلطان المعظم تمام دنیا کے مسلمانوں کے بادشاہ ہیں۔ اُن کے دلوں پر حکومت کرتے ہیں اور تمام مسلمان اُن سے محبت کرتے ہیں۔

مسلمانو! یاد رکھو! جس شخص کو سلطان المعظم سے محبت نہیں، اُسے اسلام سے تعلق نہیں''۔ مسلمان وہی ہے جسے حضرت سلطان المعظم خلیفۃ المسلمین سے دلی عقیدت اور محبت ہو۔ سلطان المعظم ہماری روح ہیں، ہم جسم ہیں، اگر ہم جسم ہیں تو وہ ہمارا سر ہیں۔ ہم اُن کے بل پر نازاں ہیں۔ وہ ہمارے لیے باعث افتخار ہیں۔ ہمیں فخر ہے ہمیں ناز ہے کہ ہمارا بادشاہ موجود ہے اور وہی اکیلا بادشاہ ہے جس کے سامنے تمام عالم کے مسلمان سر تسلیم خم کرتے ہیں۔ سلطان المعظم خلیفۃ المسلمین ہیں۔ ہمارا سلطان المعظم سے اور سلطان المعظم کا ہم سے وہی تعلق ہے جو انگریزوں کا عیسائی سلطنتوں سے ہے۔ انگریزو! ذرا غور کرو کہ تم نے عیسائی سلطنتوں کو آزاد کرا دیا، تم نے بہت سے ملک ترکوں سے چھین کر اپنے عیسائی بھائیوں کے حوالے کر دیئے۔ اب ہم کچھ کرنا چاہتے ہیں تو یہ تمہاری ہی تقلید ہے، یہ سبق تو اس زمانے میں جب ہم اسلام کو بھول چکے ہیں، تم ہی نے یاد کرایا۔ اس میں تم ہی ہمارے استاد ہو۔'' (ص ۹۴۔۵۹۳)

قارئین کرام! ذرا غور فرمائیں کہ سر میاں فضل حسین کی الزام تراشیوں سے بھرپور ڈائری تو بہت بعد میں چھپی لیکن حضرت امیر ملت رحمۃ اللہ علیہ نے ان بے سروپا، بغض وعناد اور مکر وفریب پر مبنی باتوں کا جواب ۱۹۲۱ء میں ہی دے دیا تھا۔ سچ فرمایا مخبر صادق میرے آقا ومولا حضور سید عالم صلی اللہ علیہ وسلم نے کہ

''مومن کی فراست سے ڈرو کہ وہ خدا (جل شانہ) کے نور سے دیکھتا ہے''۔

یہاں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم سر میاں فضل حسین کا مختصر تعارف بھی کراتے جائیں تا کہ اُس کی اصل حقیقت سامنے آجائے۔

سر میاں فضل حسین (۱۹۳۶ ۔ ۱۸۷۷) بٹالہ ضلع گورداسپور (مشرقی پنجاب) کے راجپوت گھرانے میں پیدا ہوئے۔ بیرسٹری کرنے کے بعد حکومت برطانیہ کی وفاداری کا پیشہ اختیار کیا۔ ۱۹۲۳ء میں ''یونینیسٹ پارٹی'' کی بنیاد رکھی جس کے تاحیات صدر رہے۔ اس پارٹی کا مقصد و مدعا مسلمان اور ہندو سکھ جاگیرداروں کے مفادات کا تحفظ تھا۔ یہ پارٹی مسلم لیگ کے خلاف کام کرتی تھی اور مسلمانانِ پنجاب کی وحدتِ ملی کو زبردست نقصان پہنچایا۔ ۱۹۲۵ء میں حکومت برطانیہ نے ''سر کا خطاب دیا''۔ ۱۹۲۶ء تا ۱۹۳۰ء پنجاب کے ریونیو ممبر رہے۔ ۱۹۳۰ء تا ۱۹۳۳ء وائسرائے کی ایگزیکٹو کونسل کے رکن اور ۱۹۳۶ء میں پنجاب کے وزیر تعلیم بنے۔

چونکہ اس پارٹی کو قادیانیوں کی پشت پناہی حاصل تھی لہٰذا ۱۹۳۴ء میں سر میاں فضل حسین کی سفارش پر سر ظفر اللہ خاں قادیانی کو وائسرائے کی انتظامی کونسل کا رکن نامزد کیا گیا جب کہ مسلمانوں کی یہ شدید خواہش تھی کہ وائسرائے کی انتظامی کونسل میں سر فضل حسین کی جگہ کسی ایسے آدمی کی رکنیت ملے جو اُن کا صحیح ترجمان ہو۔ خصوصاً ''روزنامہ زمیندار'' لاہور نے اس کے خلاف ایک بھرپور مہم چلائی۔ علامہ اقبال رحمتہ اللہ علیہ کو سر فضل حسین پسند نہیں کرتا تھا کیونکہ وہ اس کی یونینسٹ پارٹی جس کو سر ظفر اللہ خان اور قادیان پال پوس رہے تھے، تنقید کا نشانہ بناتے تھے۔

۱۹۳۵ء کے ایکٹ کے تحت ۱۹۳۶ء کے موسم سرما میں انتخابات کا انعقاد ہونا تھا۔ اس وقت پنجاب میں مسلم لیگ کی تنظیم نہ ہونے کے برابر تھی۔ ۱۹۳۶ء میں جب حضرت قائداعظم رحمتہ اللہ علیہ نے مسلم لیگ کی باگ دوڑ سنبھالی اور پنجاب میں جماعت کو منظم کرنا چاہا تو سر فضل حسین دھاڑا:

''پنجاب کے معاملے میں بمبئی کا وکیل دخل اندوزی سے باز

رہے''۔

مسلم لیگ انتخابات لڑنے کے لیے ایک پارلیمانی بورڈ بنا رہی تھی۔ چونکہ قادیانی یونینسٹوں کے سرگرم حامی تھے لہٰذا سر فضل حسین نے قادیاں جا کر مرزا محمود احمد سے ملاقات کی جس کے نتیجے میں انتخابات میں قادیانیوں نے مسلم لیگ کی مخالفت کی۔

یہ تھا سر میاں فضل حسین کا کردار۔ ظاہر ہے کہ اس کردار کا مالک انگریز، ہندو اور سکھ تگڈم سے لڑنے والے مرد مجاہد حضرت امیر ملت رحمتہ اللہ علیہ پر الزام تراشی نہ کرے تو کیا کرے گا۔

(انسائیکلوپیڈیا پاکستانیکا''، سیّد قاسم محمود، کراچی طبع دوم اکتوبر ۱۹۹۸ء صفحہ ۱۵۔۱۴۷، ''انسائیکلوپیڈیا تحریک پاکستان''، اسد سلیم شیخ مطبوعہ لاہور ۱۹۹۹ء صفحہ ۹۰۷، ۱۲۲۰، ''تحریک احمدیت'' بشیر احمد (مترجم: احمد علی ظفر) عبداللہ اکادمی لاہور سن ندارد صفحہ ۳۵۱، ۳۵۹)۔

☆

اب ہم گورنر پنجاب سر مائیکل ایڈوائر کے اعزاز میں پنجاب کے موروثی جاگیردار گدی نشینوں کی طرف سے گورنمنٹ ہاؤس لاہور میں پیش کیے گئے سپاس نامے کی طرف آتے ہیں۔ مضمون نگار جناب ڈاکٹر محمد خورشید کی ممدوح جماعت مجلس احرار کے نفس ناطقہ مرزا غلام نبی جانباز نے اپنی کتاب ''حیات امیر شریعت'' مطبوعہ لاہور ۱۹۷۶ء کے صفحہ ۹۲ تا ۹۸ پر بڑی شدومد سے سپاس نامہ نقل کیا ہے اور صفحہ ۹۷ تا ۹۸ پر سپاسنامہ کے المستدعیان کے نام بھی دیئے ہیں مگر بفضل خدا (جل جلالہ) حضرت امیر ملت علیہ الرحم کے دستخط شامل نہیں ہیں۔ سچ ہے کہ

مدعی لاکھ پہ بھاری ہے گواہی تیری

علاوہ ازیں میرے پیش نظر میاں اللہ بخش طارق کی کتاب مستطاب تاریخ'' پاکپتن'' مطبوعہ پاکپتن شریف جون ۱۹۹۴ء موجود ہے جس کے صفحہ ۱۲۰ تا ۱۲۲ سپاسنامہ کا متن نقل کیا گیا ہے اور آخر میں سپاسنامہ پیش کرنے والے المستدیان کے نام بھی درج ہیں مگر حضرت

امیر ملت قدس سرہ العزیز کا اسم گرامی کہیں بھی نظر نہیں آتا۔ معلوم نہیں کہ ڈاکٹر صاحب نے سرمیاں فضل حسین جیسے آدمی کی روایت کو کیسے قابل اعتماد سمجھ کر نقل کرنے میں کوئی باک محسوس نہ کیا۔ اللہ تعالیٰ (جل جلالہ) ہدایت نصیب فرمائے۔ (کتاب ہذا کا صفحہ ۲۰۲ بھی ملاحظہ ہو)

☆

مجلس احرار والے اپنے آپ کو دیانتدار اور دوسرے تمام قومی خدمت گاروں کو بددیانت سمجھتے تھے حالانکہ خود لاکھوں کے چندے ہضم کر گئے۔ اس سلسلہ میں روزنامہ ''نوائے وقت'' لاہور بابت ۷ جولائی ۱۹۹۰ء کا کالم ''سرِ راہے'' قابل توجہ ہے:

''مجلس احرار (شروع میں) مخلص نوجوانوں کی جماعت تھی۔ جب مخالفین کی طرف سے اس پر چندہ خوری کے الزامات تواتر سے لگنے شروع ہوگئے تو مجلس کے ایک لیڈر مولانا مظہر علی اظہر (بقول رئیس الاحرار مولانا محمد علی جوہر، مولانا اِدھر علی اُدھر) نے اعلان کیا کہ یہ سب الزامات بے بنیاد ہیں بلکہ دیانت تو مجلس احرار کے گھر کی لونڈی ہے۔ اس پر مولانا عبدالمجید سالک نے (اپنے اخبار روزنامہ ''انقلاب'' کے کالم) ''افکار و حوادث'' میں تبصرہ کرتے ہوئے لکھا تھا کہ:

> ''بے شک دیانت مجلس احرار کے گھر کی لونڈی ہے لیکن مجلس احرار نے یہ لونڈی بے نکاحی رکھی ہوئی ہے۔''

اب ذرا لگے ہاتھوں مجلس احرار کے امیر شریعت سیّد عطاء اللہ بخاری کے منظور نظر جناب شورش کاشمیری کی رائے بھی ملاحظہ فرمالیجئے گا:

> ''اصلاً شہید گنج کے مقابلہ میں اُن (احرار رہنماؤں) سے ایک سیاسی غلطی ہوگئی۔ اگر وہ اس میں حصہ لے کر اس کا رخ پلٹتے تو زیادہ مفید نتائج پیدا ہوتے انہوں نے کنارہ کشی اختیار کر کے حالات کا صحیح اندازہ نہ کیا جس سے مار کھا گئے''۔ (سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری'' مولفہ شورش کاشمیری، مطبوعات چٹان لاہور) ۱۹۵۷ء

ص ۹۸۔۹۷، طبع دوم مئی ۱۹۷۸ء صفحہ ۱۱۰)

☆

شورش کاشمیری نے اپنی کتاب ''بوئے گل نالہ دل، دود چراغ محفل (سوانح و افکار) جلد اول لاہور جولائی ۱۹۷۲ء صفحہ ۱۰۱ اور اپنی دوسری کتاب ''پس دیوار زنداں'' طبع سوم جولائی ۱۹۷۱ء صفحہ ۵۲ اور جانباز مرزا نے اپنی تالیف تحریک مسجد شہید گنج، مطبوعہ مکتبہ ''تبصرہ'' لاہور فروری ۱۹۸۸ء صفحہ ۱۳۰ اور صفحہ ۳۸۱ پر بھی یہی الزام تراشیاں کی ہیں۔ ان سب کا جواب صفحات گزشتہ میں دیا جا چکا ہے۔ ان احراریوں کی بددیانتی، پاکستان دشمنی، مسلم لیگ کے خلاف دریدہ دہنی اور تحریک پاکستان کے حامی علماؤ مشائخ کی شان میں بدزبانی کے بارے میں تحریک پاکستان کے نامور کارکن اور وطن عزیز کے نامور صحافی جناب محمد شفیع (م۔ش) کی ایک تحریر نقل کرنا ازبس ضروری ہے:

> ''جناب مرزا غلام نبی جانباز مسلم لیگ میں کیڑے نکالنے، مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کو مغلظات سنانے، مسلم لیگ کے حامی علمائے کرام کے خلاف دشنام طرازی کرنے اور مجلس احرار اسلام کے موقف کو صحیح ثابت کرنے اور کانگریسی علمائے کرام کی تعریفوں کے پل باندھنے میں مورخ کا کردار ادا کرنے کی بجائے ایک جانبدار، عامیانہ انداز کے پرچارک نظر آتے ہیں، مسلم لیگ کو بدنام کرنے کے لیے وہ کسی موقع کو ہاتھ سے جانے نہیں دیتے، بعض اوقات مسلم لیگ کے موقف کا استہزاء اڑانے کے لیے وہ واقعات کا اختراع بھی کر لیتے ہیں''۔ (روزنامہ نوائے وقت'' لاہور بابت ۲۲ اگست ۱۹۸۲ء م ش کی ڈائری)

☆

پاکستان کے ایک اور ممتاز صحافی جناب رفیق ڈوگر روزنامہ ''نوائے وقت'' لاہور بابت

۲۵ اکتوبر ۱۹۸۴ء میں جانباز مرزا کی کتاب ’’کاروانِ احرار‘‘ جلد ہفتم پر یوں تبصرہ کرتے ہیں:

’’اس کتاب کو پڑھ کر اس ضرورت کا شدت سے احساس ہوتا ہے کہ پاکستان میں تحریک پاکستان اور اس کی مخالف جماعتوں کی صحیح تاریخ لکھنا اشد ضروری ہے تا کہ مرزا جانباز اور اُن کے دیگر ’’حریت‘‘ پسند ساتھیوں کی یہ ’’صفائی‘‘ اور غلط فہمیاں ہی آگے چل کر تاریخ نہ بن جائیں۔ وہ جھوٹ کو اس جرأت اور دیدہ دلیری سے بیان کرتے ہیں تو کوئی سچائی اور حقیقت کا علمبردار بھی تو ہونا چاہیے‘‘۔

☆

جناب رفیق ڈوگر کی اس بات کو بڑھاتے ہوئے بزرگ صحافی میاں محمد شفیع (م۔ش) اپنے کالم ’’م ش کی ڈائری‘‘ مطبوعہ روزنامہ نوائے وقت بابت ۳۱ اکتوبر ۱۹۸۴ء میں یوں اظہار خیال کرتے ہیں:

’’برصغیر میں سیّد جمال الدین افغانی اور سیّد احمد شہید نے دو مختلف مکتبہ ہائے فکر کو جنم دیا تھا۔ علامہ اقبالؒ اور قائد اعظم دونوں سیّد جمال الدین افغانی کے مکتب فکر سے تعلق رکھتے تھے جب کہ مولانا حسین احمد مدنی اور مفتی کفایت اللہ (دہلوی) سیّد احمد شہید کے مکتب فکر کے طالب علم تھے۔ قائداعظم اور علامہ اقبال نے برصغیر کے مسلمانوں کے لیے ایک علیحدہ وطن کے ذریعہ تحفظ ذات اور تکمیل ذات اور تحفظ دین کی راہ دیکھی تو مولانا حسین احمد مدنی اور مفتی کفایت اللہ صاحب نے اکھنڈ بھارت میں مسلمانوں کے مستقبل کو محفوظ رکھنے کا پروگرام بنایا۔

بالآخر مسلم عوام کی تائید سے مسلم لیگ نے پاکستان کے خواب کو سچا

کر دکھایا۔ پاکستان کے قیام کے بعد بابائے قوم حضرت قائداعظم محمد علی جناح نے اپنے آقا و مولا حضور نبی اکرم ﷺ کی سنت کی روشنی میں ماضی کے ہر قسم کے اختلافات اور تلخیوں کو بھلا کر پاکستان میں تمام سیاسی جماعتوں اور طبقوں سے خلوص دل سے اپیل کی کہ وہ پاکستان کے استحکام کے لیے مل جل کر باہمی تعاون سے کام کریں۔ چنانچہ یہ بات ریکارڈ سے ثابت کی جاسکتی ہے کہ قائداعظم نے کسی فرد یا کسی جماعت کے خلاف ان کے ماضی کے پیش نظر کوئی انتقامی کاروائی نہ کی۔

لیکن یہ کس قدر المناک بات ہے کہ بقول جناب رفیق ڈوگر پاکستان میں آج بھی ایسے نام نہاد مورخ اور سیاسی کارکن موجود ہیں جو تحریراً یہ اعلان کرنے میں کوئی شرم محسوس نہیں کرتے کہ وہ پاکستان کے مخالف ہیں اور آج بھی اس کے قیام کی مخالفت میں اپنے موقف پر قائم ہیں۔ انا اللہ وانا الیہ راجعون۔

کیا پریس برانچ نے اس ہرزہ سرائی کا کوئی نوٹس لیا ہے؟ میری مراد حاجی مرزا غلام نبی جانباز کی کتاب ''کاروان احرار'' کی تازہ ترین جلد سے ہے۔''

۳

میرے پیش نظر جناب مولانا شاہ تراب الحق قادری آف کراچی کی کتاب ''دینی تعلیم'' مطبوعہ زاویہ پبلشرز لاہور ۲۰۰۴ء ہے، جس کے صفحہ ۷۶۔۷۵ پر ''آل انڈیا سنی کانفرنس'' اکابر شرکاء اور تحریک پاکستان میں علماء و مشائخ کے کردار کے بارے میں تین تین سوالات قائم کیے گئے ہیں۔ جوابات میں اکابرین اہلسنت کے اسمائے گرامی درج ہیں مگر تینوں سوالات کے جوابات میں مربیِ قائداعظم سرپرست تحریک پاکستان اور مؤیدِ مسلم لیگ اور آل انڈیا سنی

کانفرنس کے صدر قبلہ عالم امیر ملّت حضرت پیر سیّد جماعت علی شاہ محدث اعظم علی پوری قدس سرہ العزیز کا نام نامی اسم گرامی غائب ہے۔

اس سلسلہ میں جناب محمد صادق قصوری نے جناب شاہ صاحب کی خدمت میں ایک احتجاجی عریضہ ارسال کیا جس کے جواب میں اُنہوں نے اپنے ۵ جنوری ۲۰۰۵ء کے گرامی نامہ میں لکھا کہ:

> ''آپ کا گرامی نامہ موصول ہوا، جس میں آپ نے کتاب ''دینی تعلیم'' میں تحریک پاکستان میں علماء ومشائخ کے کردار کے حوالہ سے حضرت امیر ملّت پیر سیّد جماعت علی شاہ صاحب محدث علی پوری علیہ الرحمہ کا نام درج نہ کرنے پر توجہ دلائی ہے جس پر فقیر بے حد ممنون ہے، پیر صاحب کا نام سہوارہ گیا۔ اور صرف پیر صاحب ہی نہیں اور بھی بزرگوں کے نام رہ گئے ہیں۔ اس وضاحت کے بعد اُمید ہے کہ آپ تعصب کی بات کو دل سے نکال دیں گے''۔

اب سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ''آل انڈیا سنی کانفرنس، کے بانی صدر، مراد آباد سنی کانفرنس (۱۹۲۵ء) بدایوں کانفرنس (۱۹۳۵ء) اور بنارس کانفرنس (۱۹۴۶ء) کے صدر، علماء و مشائخ کے سرخیل اور پیشوا کا نام سہواُرہ جانا سمجھ سے باہر ہے کیونکہ اُن کے تذکرہ کے بغیر آل انڈیا سنی کانفرنس اور تحریک پاکستان کا تصور ہی ناممکن ہے۔ یا پھر شاہ صاحب کے نزدیک حضرت امیر ملّت رحمتہ اللہ علیہ کی کوئی حیثیت ہی نہیں ورنہ سہو ہو جانا ناممکنات میں سے ہے۔ دراصل یہ تعصب باطن ہے، جس کا ثبوت قصوری صاحب کے نام مولانا محمد جمیل الرحمٰن سعیدی آف کراچی کے ایک خط محررہ یکم مئی ۲۰۰۶ء سے ملتا ہے۔ وہ رقمطراز ہیں کہ:

> یہاں ایک مشہور شاہ صاحب ہیں کراچی کے، وہ اکثر ہمارا قلب مجروح کرتے ہیں کہ پیر جماعت علی شاہ کی نسبت کہ وہ عالم دین نہیں تھے، صرف صوفی اور پیر تھے''۔

اب اُن شاہ صاحب کو یہ کون سمجھائے کہ اگر فخر پنجاب مولانا غلام قادر بھیروی، استاذ زمن مولانا فیض الحسن سہارنپوری، وارث مسند مجددیہ مولانا ارشاد حسین رام پوری، مفتیٔ زماں مولانا مفتی محمد عبداللہ ٹونکوی، استاذ الاساتذہ مولانا محمد مظہر سہارنپوری، بانی ندوۃ العلماء، مولانا سیّد محمد علی مونگیری، رئیس القراء قاری عبدالرحمٰن پانی پتی، اویس زماں مولانا فضل رحمٰن گنج مراد آبادی، استاذ کل مولانا احمد حسن کانپوری اور قطب مکہ شاہ عبدالحق الہ آبادی مہاجر مکی رحمۃ اللہ علیہم کا شاگرد اور فیض یافتہ عالم دین نہیں ہوگا تو پھر اور کون ہوگا؟

۴

ماہنامہ ''دعوت تنظیم الاسلام'' گوجرانوالہ بابت فروری ۲۰۰۸ء صفحہ ۵۰ تا ۶۱ (اور بقیہ صفحہ ۳۲ پر) جناب علامہ محمد اشفاق مجددی کا مضمون ''مجاہد اول تحریک ختم نبوت خطیب الاسلام صاحبزادہ فیض الحسن شاہ نقشبندی مجددی اور زعماء اہلسنت'' شائع ہوا ہے، صفحہ ۵۷ پر مضمون نگار لکھتے ہیں کہ:

''۱۹۰۰ء کی بات ہے جب پیر طریقت قافلہ سالار تحریک حرّیت امیر ملّت حضرت پیر سیّد جماعت علی شاہ علی پوری رحمۃ اللہ علیہ خطۂ پنجاب میں سلسلہ نقشبندیہ کے عظیم مرکز آستانہ عالیہ آلومہار شریف ضلع سیالکوٹ میں حاضر ہوئے۔ یہ دور تھا قطب المشائخ حضرت خواجہ سیّد محمد امین شاہ رحمۃ اللہ علیہ کا۔ آپ ان دنوں پیرانہ سالی اور شدید علالت کی بنا پر صاحب فراش تھے۔ امیر ملّت حاضر خدمت ہوئے، قدم بوسی کی اور فتنۂ قادیانیت کے بارے میں گوش گزار کرتے ہوئے عرض کی کہ ''۲۰ جولائی ۱۹۰۰ء کو مرزا قادیانی نے اشتہارات کے ذریعے ہمیں چیلنج دیا ہے اور ۲۵، ۲۶ اگست کی درمیانی شب شاہی مسجد لاہور میں مباہلہ ہوگا لہٰذا ایک تو دعاؤں کی درخواست ہے اور دوسرا ساتھ چلنے کی اپیل ہے۔'' اس جرأت و ہمت پر نہایت مسرور ہوئے، ڈھیروں دعائیں دیں اور فرمایا:

شاہ صاحب! میں عمر کے جس حصے میں ہوں، وہ آپ کے سامنے ہے، اس معرکے میں جانا میرے لیے بہت بڑی سعادت ہے مگر

افسوس! اس وقت میرے لئے جانا نہایت مشکل ہے.......... مگر ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں، جاؤ! اللہ (جل جلالہ) آپ کو فتح و کامرانی سے ہمکنار کرے گا۔ لیکن یاد رکھو! اکیلے نہیں جانا، گولڑہ شریف سے حضرت پیر سیّد مہر علی شاہ کو ساتھ لے کر جانا''۔

چنانچہ ان شخصیات نے مرزا قادیانی کا چیلنج قبول کیا اور ۲۵ اگست ۱۹۰۰ء کو جرأت رندانہ لے کر میدان میں آ گئے۔ مسلمانان برصغیر پاک و ہند کے یہ نمائندے ہزاروں فدایان ختم نبوت کی موجودگی میں تین دن تک مرزا کا انتظار کرتے رہے مگر مرزا نے نہ آنا تھا .... نہ آیا کیونکہ حق کا فیصلہ ہے۔ جاء الحق و زھق الباطل ان الباطل کان زھوقاً (بنی اسرائیل: ۸۱) یہ سب کیا تھا..... حق کی فتح..... مشائخ آلومہار شریف کی توجہات قدسیہ کا فیضان''۔

☆

اب ''تذکرہ مشائخ آلومہار شریف'' از افاضاتِ ابوالبیان مولانا محمد سعید احمد مجددی مرتبین محمد بشارت علی مجددی، محمد نوید اقبال مجددی، مطبوعہ گوجرانوالہ مارچ ۲۰۰۹ء صفحہ ۴۲۶_۲۷ بھی ملاحظہ فرمالیجئے:

''فتنہ مرزائیت پر فتح یابی کے لیے محدّث علی پوری کی آلومہار شریف حاضری۔'' مرزا غلام احمد قادیانی نے انگریز حکومت کے ایماء پر جھوٹی نبوت کا دعویٰ کر کے برصغیر میں فتنہ پھیلا رکھا تھا۔ یہ ۱۹۰۸ء کے ابتدائی دنوں کی بات ہے جب حضرت خواجہ سیّد محمد امین شاہ قدس سرہ، پر فالج کا حملہ ہو چکا تھا اور آپ کافی کمزور ہو چکے تھے، اسی مسئلہ پر رہنمائی کے لیے حضرت محدث علی پوری قدس سرہ حاضر ہوئے۔ حضرت ثانی قدس سرہ، اور تمام خدام مراقبہ میں

تھے، محدث علی پوری بھی مراقب ہو گئے۔ حضرت ثانی قدس سرہٗ
نے مراقبہ سے سر مبارک اٹھایا تو فرمانے لگے:

''مجاہد اسلام کیسے آنا ہوا''؟

حضرت محدث علی پوری قدس سرہ نے عرض کی، فتنہ مرزائیت ترقی کرتا جا رہا ہے، ہم فیصلہ کن مباہلہ یا مناظرہ کرنا چاہتے ہیں، آپ ہمارے ساتھ چلیں۔

حضرت ثانی فرمانے لگے، شاہ جی! میں بیمار بھی ہوں اور فالج نے بہت کمزور بھی کر دیا ہے۔ آپ جائیں، اللہ تعالیٰ (جل جلالہ) آپ کو شاندار فتح عطا فرمائے گا اور مرزا کو ذلیل کرے گا اور میری طرف سے اُس شیطان کو کہہ دینا کہ ''اے اسلام کے باغی! باز آ جا، ورنہ تیری ہلاکت کا سبب یہی تیری بغاوت ہے اور دیکھو ساتھ پیر مہر علی شاہ علیہ الرحمۃ کو بھی ساتھ لے لو۔ حضرت محدث علی پوری رحمتہ علیہ الرحمہ گولڑہ شریف پہنچے اور حضرت ثانی صاحب کا پیغام دیا، وہ فوراً تیار ہو گئے''۔

☆

قارئین کرام! آپ نے ماہنامہ ''دعوت تبلیغ الاسلام'' گوجرانولہ اور تذکرہ مشائخ آلو مہار شریف'' کے حوالے ملاحظہ فرمائے۔ پہلے حوالہ میں ۱۹۰۰ء کا ذکر کیا گیا ہے جب کہ دوسرے حوالہ میں ۱۹۰۸ء کا۔ گویا دونوں حوالوں میں آٹھ سال کا فرق ہے۔ دراصل مضمون نگار اور تذکرہ مشائخ آلو مہار شریف'' کے قابل صد احترام مرتبین اس بات کا ادراک ہی نہیں کر سکے کہ ۱۹۰۰ء میں حضرت پیر سید مہر علی شاہ گولڑوی علیہ الرحمہ لاہور تشریف لا کر مرزا قادیانی کو للکارتے رہے مگر وہ سامنے نہ آیا بلکہ راہ فرار اختیار کر گیا۔ اس موقعہ پر حضرت امیر ملت محدث اعظم علی پوری رحمتہ اللہ علیہ بھی حضرت گولڑوی کے ساتھ موجود تھے جب ۱۹۰۸ء میں حضرت امیر ملت نے مرزا قادیانی کو چیلنج کیا تو حضرت گولڑوی بھی تشریف فرما ہوئے لیکن وہ ایک دو دن بعد حضرت امیر ملت سے یہ کہہ کر واپس چلے گئے کہ:

''شاہ صاحب! میں تو واپس جاتا ہوں، آپ اپنا کام جاری رکھیں''۔

حضرت امیر ملّت نے اُن سے کہا:

''آپ مجھے اکیلا چھوڑ کر کیسے تشریف لے جائیں گے''؟

اس پر حضرت گولڑوی رحمتہ اللہ علیہ نے فرمایا!

''میں گھر سے شکار کرنے آیا تھا مگر مجھے معلوم ہوا کہ یہ شکار میرے مقدر میں نہیں ہے بلکہ آپ کے مقدر میں ہے۔ اس لیے آپ ٹھہریں اور اپنا کام کرتے رہیں۔'' (سیرت امیر ملّت مطبوعہ علی پور سیّداں ۱۹۷۵ء ص ۲۴۷)

لیکن مرزا جب مقابلے پر نہ آیا تو ۲۵۔۲۶ مئی ۱۹۰۸ء کی درمیانی رات حضرت امیر ملّت علیہ الرحمہ نے بادشاہی مسجد لاہور کے جلسۂ عام میں یہ اعلان فرمایا!

''میں مرزا کو چوبیس گھنٹے کی مہلت دیتا ہوں کہ وہ آ کر میرے ساتھ مباہلہ کرے۔'' پھر سب لوگوں کو مخاطب کر کے فرمایا کہ:

''میں آپ سب کے روبرو اعلان کرتا ہوں کہ خدا (جل جلالہ) کے فضل و کرم سے وہ میرے مقابلے کو نہیں آئے گا کیونکہ میرا نبی ﷺ سچا ہے اور میں صدق دل سے اس سچے نبی ﷺ کا غلام ہوں۔ اللہ تعالیٰ (جل جلالہ) آئیندہ چوبیس گھنٹوں کے اندر اپنے حبیب پاک ﷺ کے صدقے میں اس جھوٹے نبی سے ہمیں نجات عطا فرمائے گا''۔

چنانچہ اسی رات تھوڑی دیر کے بعد مرزا جی کو ہیضہ ہوا، نصف شب گزرنے تک مرض نے شدت اختیار کر لی۔ منہ سے بھی قے میں نجاست نکلتی تھی۔ ۲۶ مئی ۱۹۰۸ء کو صبح تک مرزا جی آنجہانی ہو گئے۔

قارئین کرام نے ملاحظہ فرمایا کہ مضمون نگار اور مرتبین کتاب نے ۱۹۰۰ اور ۱۹۰۸ء کے واقعات کو آپس میں خلط ملط کر دیا۔ ہم حضرت قبلہ سیّد محمد امین شاہ رحمتہ اللہ علیہ کی بزرگی،

عظمت اور روحانی خدمات کو سلام کرتے ہیں اور اُن کا بے حد احترام کرتے ہیں اور دل و جان کرتے ہیں مگر بصد معذرت عرض کریں گے کہ ردّ قادیانیت کے سلسلہ میں ۱۹۰۰ء یا ۱۹۰۸ میں حضرت امیر ملّت رحمتہ علیہ کا اُن کی خدمت میں حاضر ہونا ثابت نہیں ہے۔ میرے سامنے حضرت امیر ملّت کی سوانح حیات ''سیرت امیر ملّت'' اور حضرت گولڑوی کی سوانح عمری ''مہر منیر'' دونوں موجود ہیں، ان میں کہیں بھی حضرت امیر ملّت کا آلو مہار شریف میں حاضر ہونے اور حضرت سیّد محمد امین شاہ صاحب کے حکم پر گولڑہ شریف جانے کا ذکر نہیں ہے۔ اور پھر حضرت امیر ملّت علیہ الرحمہ کے بارے میں تحقیقی کام کرتے ہوئے عمر بیت گئی ہے، کہیں بھی یہ روایت اور یہ حوالے نظر سے نہیں گزرے اور پھر فالج کے مریض بزرگ سے، جو چل پھر نہ سکتے ہوں، اپنے ساتھ جانے کی استدعا کرنا کتنی مضحکہ خیز بات ہے۔

اے کاش! ہمارے صاحب قلم حضرات ایسی باتیں ضبط تحریر میں لانے سے قبل وادئ تحقیق میں بھی کچھ وقت گزار لیا کریں تو بہتر ہوگا۔ اپنے مشائخ کی سربلندی اور عظمت بڑھانے کے لیے ایسے فرضی واقعات کسی بھی لحاظ سے جائز اور مستحسن نہیں ہیں اور نہ ہی سودمند۔

☆

''تذکرہ مشائخ آلو مہار شریف'' کے صفحہ ۲۲۳-۲۲۴ پر لکھا ہے کہ حضرت امیر ملّت اور حضرت ثانی علی پوری رحمتہ اللہ علیہم سیّد محمد امین شاہ صاحب کے ساتھ تبلیغی دورے کرتے، آلو مہار شریف حاضر ہوتے تو کھیتوں اور گھوڑوں کی کھرلیوں میں چھپ کر اور فرش پر بیٹھ کر محویت اور مستی کے مزے لیتے۔ تین برس گزرنے کے بعد ایک دن حضرت سیّد محمد امین شاہ صاحب نے اپنے خلیفہ رکن الدین سے فرمایا کہ:

> ''ان سے کہہ دو کہ آلو مہار شریف کی طرف سے تمہیں مکمل فیض مل چکا ہے، اب چورہ شریف کے تاجدار حضرت خواجہ فقیر محمد قدس سرہ کی طرف رجوع کرو۔''

نیز تذکرہ ہذا کے صفحہ ۴۲۴ پر یہ بھی لکھا گیا ہے کہ:

''یہ دونوں بزرگ ابتداء میں حضرت شمس الہند قدس سرہ کے خلیفہ حضرت محمد صدیق قدس سرہ کے خلیفہ حضرت مرزا سکندر بیگ (موضع جگت رائے متصل علی پور سیّداں) کی بیعت تھے جو مدتوں حضرت شمس الہند کی خدمت اور صحبت میں رہے۔ انہوں نے تکمیل فیض کے بعد آلومہار شریف اور آلومہار شریف والوں نے چورہ شریف پیش کر کے دستار خلافت سے سرفراز کروایا اور اس نسبت کے بزرگوں کا یہی معمول رہا ہے کہ وہ اپنے مریدوں کو اپنے مشائخ سے اسی طریق کے مطابق فیض دلاتے رہتے ہیں۔''

☆

مجھے نہایت ہی افسوس کے ساتھ عرض کرنا پڑ رہا ہے کہ دونوں واقعات بھی حقیقت سے دُور بلکہ بہت ہی دور ہیں۔ ''سیرت امیر ملت'' اور حضرت ثانی علی پوری کی سوانح عمری ''انوار ثانی'' مصنفہ پروفیسر محمد حسین آسی، ان خود ساختہ روایات کا ساتھ نہیں دیتیں بلکہ حضرت امیر ملّت پر تو ''سیرت امیر ملّت'' کے علاوہ اور بھی بہت سی کتابیں منصۂ شہود پر جلوہ گر ہو چکی ہیں جو سب کی سب ان وضع کردہ روایات سے خالی ہیں۔ نجانے ایسی بے سرو پا باتیں لکھنے سے انہیں کیا حاصل ہوتا ہے اور اُن کے مشائخ عظام کی عزت وشہرت اور بزرگی و عظمت میں کیا اضافہ ہوتا ہے؟

حقیقت یہ ہے کہ حضرت امیر ملّت کی پہلی بیعت اپنے والد گرامی حضرت سیّد کریم شاہ علیہ الرحمہ سے سلسلہ عالیہ قادریہ'' میں تھی اور دوسری بیعت ''سلسلہ عالیہ نقشبندیہ'' میں چورہ شریف ضلع اٹک کے سرتاج حضرت باباجی فقیر محمد فاروقی چوراہی علیہ الرحمتہ سے تھی۔ درمیان میں آلومہار شریف کا واسطہ صرف اور صرف داستان گوئی ہے اور بس۔ حضرت امیر ملّت تو براہ راست حضرت بابا چوراہی سے موضع چک قریشیاں ضلع سیالکوٹ میں بیعت ہوئے تھے نہ

کہ آلومہار شریف کی وساطت سے۔ (سیرت امیر ملت صفحہ ٦٧)

☆

یہ بھی حیران کن بات ہے کہ حضرت امیر ملت قدس سرہ العزیز کے چہلم شریف منعقدہ ٧۔ اکتوبر ١٩٥١ء بروز اتوار، خطیب اسلام حضرت صاحبزادہ سید فیض الحسن شاہ صاحبؒ ''سجادہ نشین آلومہار شریف نے اپنے فصاحت و بلاغت سے بھرپور خطاب میں آلومہار شریف سے حضرت امیر ملت کے روحانی استفادے کا ذکر تک نہیں کیا۔ اگر یہ بات حق اور سچ ہوتی تو صاحبزادہ صاحب بڑے فخر کے ساتھ بیان فرماتے کہ حضرت امیر ملت ہمارے بزرگوں کے بھی روحانی فرزند اور فیض یافتہ ہیں۔ یاد رہے کہ حضرت صاحبزادہ صاحب کا خطاب ہم ابتدا میں نقل کر چکے ہیں جو قارئین کرام کی خصوصی توجہ کا مستحق ہے۔

☆

حضرت صاحبزادہ سیّد فیض الحسن شاہ صاحب رحمتہ اللہ علیہ پر حضرت امیر ملت کی خصوصی شفقت تھی، جس کا اقرار صاحبان ''تذکرہ مشائخ آلومہار شریف'' نے بھی حضرت صاحبزادہ صاحب کی زبانی صفحہ ٦١٧ پر یُوں کیا ہے:

''جب امیر ملت محدّث علی پوری رحمتہ اللہ علیہ کی خدمت میں حاضر ہوا تو آپ نے مجھے بے حد شفقتوں سے نوازا اور ایک چکن والا کرتہ، ایک گرم کوٹ اور غالباً ایک چادر عطا فرمائی اور میرے لیے بہت دعائیں فرمائیں''۔

☆

جناب محترم پیر کبیر علی شاہ صاحب فاروقی سجادہ نشین چورہ شریف ضلع اٹک حال متوطن لاہور کی اپنے بزرگوں کے بارے میں ''اذکار کبیر'' کے نام ایک کتاب مارچ ٢٠٠٨ء میں لاہور سے منظر عام پر آئی ہے، جس کے صفحہ ٣٤٤-٣٥ پر ''قائد اعظم محمد علی جناح کی حاضری'' کے زیر عنوان رقمطراز ہیں:

''تحریک پاکستان نے جب زور پکڑا تو اُس کے ساتھ ہی مخالفین کی طرف سے پاکستان کی مخالفت نے شدت پکڑنا شروع کی، یہاں تک کہ قائداعظم کو کافر اعظم تک کہا گیا۔ اس وقت قائداعظم محمد علی جناح، حضرت امیر ملّت پیر سیّد جماعت علی شاہ محدث علی پوری کے ساتھ آستانہ عالیہ حیدریہ چوک پیرانوالہ وسن پورہ (لاہور) میں حضور امام السالکین زبدۃ العارفین غوث زمان قطب الاقطاب حضرت خواجہ سیّد احمد نبی شاہ گیلانی کی بارگاہ عالی وقار میں دعا اور خصوصی توجہ کی غرض سے حاضر ہوئے۔ آپ نے محمد علی جناح کو خصوصی شفقت و محبت سے نوازا، دُعا کی درخواست پر بڑی محبت سے دُعا فرما کر کامیابی و کامرانی کی بشارت دی اور پیر سیّد جماعت علی شاہ علیہ الرحمہ سے فرمایا کہ فتح و کامرانی اس کی پیشانی پر لکھ دی گئی ہے۔ جب قائداعظم علیہ الرحمہ کے ساتھ مولانا محمد بخش مسلم بی اے، میاں امیر الدین صاحب جنہوں نے ''قرارداد پاکستان'' کی نوک پلک درست کی تھی اور مشائخ عظام اور علماء کرام سے روابط میں نمایاں کردار ادا کیا تھا، بھی حاضر تھے یہ حضرات اس واقعہ کے گواہ ہیں''۔

پیارے قارئین کرام نے ''اذکا کبیر'' کی روایت ملاحظہ فرمائی جو بالکل حقائق کے منافی ہے۔ قائداعظم کا لاہور آنا اور حضرت امیر ملّت پیر سیّد جماعت علی شاہ محدث علی پوری رحمتہ اللہ علیہ کے ساتھ لاہور میں حضرت خواجہ احمد نبی فاروقی چوراہی علیہ الرحمہ کی خدمت میں حاضر ہونا درست نہیں ہے۔ آج تک حضرت قائداعظم کے کسی بھی سوانح نگار نے اس واقعہ کا ذکر نہیں کیا اور نہ ہی حضرت امیر ملّت قدس سرہ العزیز کی سوانح حیات ''سیرت امیر ملّت''، ''تذکرہ شہ جماعت'' یا کسی اور کتاب میں مذکور ہے۔ یہ بالکل ایجاد و اختراع ہے اور بس۔

حضرت امیر ملت علیہ الرحمتہ کا حوالہ دے کر بات کو ثقہ بنانے کی سعیٔ نامشکور کی گئی ہے۔ پھر بڑی حیرانی کی بات ہے کہ اتنی بڑی شخصیتوں کی ملاقات پردہ اخفا میں رہی اور ساٹھ ستر سال بعد ۲۰۰۸ء میں صرف ان کی اپنی کتاب ''اذکار کبیر'' میں ہی جگہ پا سکی۔ کیا اس سے پہلے بزرگان چورہ شریف پر کوئی کتاب نہیں چھپی۔ اگر چھپی ہے اور ضرور چھپی ہے تو پھر اس میں اس ملاقات کا ذکر نہ ہونا کون سی مصلحت کا غماز ہے۔ کیا اب کوئی اہل علم وقلم، مورخ ومحقق اور تحریک پاکستان کا طالب علم یا استاد اس کو تسلیم کرنے پر آمادہ ہوگا؟

''اذکار کبیر'' کے فاضل مصنف نے بطور ثبوت میاں امیر الدین اور مولانا محمد بخش مسلم بی اے کے ساتھ جانے کا ذکر کر کے اپنی بات کو مستند بنانے کی سعی خام فرمائی ہے۔ میاں امیر الدین نے اپنی خودنوشت'' یادایام (جسے معروف ماہر اقبالیات پروفیسر محمد منور مرزا مرحوم نے ترتیب دیا تھا) میں اپنی معمولی معمولی باتوں کا بڑھ چڑھ کر ذکر کیا ہے مگر ''اذکار کبیر'' کی اس روایت کا ذکر مفقود ہے، اگر یہ بات سچ ہوتی تو وہ اسے بڑی شان وشوکت اور طمطراق سے اور قائداعظم کی معیت حاصل ہونے کے اعزاز کو کبھی بھی لکھنا نہ بھولتے۔ اسی طرح مولانا محمد بخش مسلم بی اے نے بھی اپنی مبارک زندگی میں اس بات کا کبھی ذکر نہیں کیا اور نہ ہی اُن کے خلد آشیانی ہونے کے بعد اُن پر لکھنے والوں نے یہ زرّیں انکشاف کیا ہے۔

تاریخ گواہ ہے کہ حضرت قائداعظم اور حضرت امیر ملت کی لاہور میں کوئی ملاقات نہیں ہوئی، حضرت امیر ملت، مسلم لیگ اور قائداعظم کے سرپرست وحامی ضرور تھے مگر وہ مسلم لیگ کے باقاعدہ ممبر یا عہدیدار نہ تھے۔ اُن کی عظیم الشان ہستی ان چیزوں سے بہت بلند وبالا تھی۔ انہوں نے اپنے پلیٹ فارم سے تحریک پاکستان کے لیے بے حد وحساب خدمات انجام دیں، کبھی مسلم لیگ کے اجلاس میں شریک نہ ہوئے۔ حتی کہ ۱۹۴۴ء میں سیالکوٹ میں منعقد ہونے والی ''پنجاب مسلم لیگ کانفرنس'' جس کی صدارت سردار عبدالرب نشتر جیسے درویش صفت سیاستدان نے کی تھی اور قائداعظم خصوصی طور پر مدعو تھے اور برصغیر کے نامور مسلم لیگی زعماء شریک تھے، میں بھی شرکت نہ کی کہ وہ ان اجلاسوں سے بے نیاز

تھے۔ وہ تو مرد قلندر اور قطب وقت تھے۔ اور ''قطب'' وہ ہوتا ہے جو کسی کے پاس نہیں جاتا بلکہ لوگ جوق در جوق اُس کے پاس حاضر ہوتے ہیں۔

مہر و مہ و انجم کا محاسب ہے قلندر!
ایام کا مرکب نہیں، راکب ہے قلندر!

حضرت امیر ملت نور اللہ مرقدہ، سے قائداعظم کی صرف ایک ہی ملاقات ہوئی جسے تاریخ نے اپنے سینے میں بحسن وخوبی محفوظ کیا ہوا ہے۔ وہ یوں کہ جون ۱۹۴۴ء میں حضرت امیر ملت، سری نگر (کشمیر) میں جلوہ افروز تھے، اتفاقاً حضرت قائداعظم بھی اُن دنوں کشمیر کے دورہ پر تھے، جب سری نگر پہنچے تو حضرت امیر ملت علیہ الرحمہ کے مرید صادق اور خلیفۂ مجاز رئیس الاحرار چوہدری غلام عباس، حضرت قائداعظم کو ساتھ لے کر آپ کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ آپ نے قائداعظم کی پرتکلف دعوت کی۔ دعوت سے فارغ ہو کر قائداعظم نے مسلم لیگ کی کامیابی اور قیام پاکستان کے لیے دُعا کی درخواست کی، جس پر آپ نے انتہائی خشوع وخضوع سے دُعا فرمائی اور کامیابی وکامرانی کی پیش گوئی فرماتے ہوئے قائداعظم کی درازیٔ عمر اور صحت کے لیے خصوصی دعا فرمائی۔

☆

(بقیہ حوالہ از صفحہ ۱۸۷)

لیجئے! ایک اور حوالہ ملاحظہ فرمائیے کہ ''پیران عظام کا دُعا نامہ اوڈوائر کے دربار میں'' کے عنوان سے حافظ محمد بخش طالب علم نے ۱۹۳۱ء میں ملتان سے ایک پمفلٹ شائع کیا تھا جو سولہ صفحات پر مشتمل ہے۔ بارہ صفحات تک تو محمد عبدالرشید کا ''مقدمہ'' احاطہ کئے ہوئے ہے، اس کے بعد سولہ صفحے کے پہلے نصف تک ''سپاسنامہ'' نقل کیا گیا ہے۔ اور سولہ صفحے کے آخری نصف حصہ میں سپاس نامہ پیش کرنے والے پیران عظام کے نام درج ہیں مگر حضرت امیر ملت کا نام نامی اسم گرامی شامل نہیں ہے۔ اُمید ہے کہ اب مزید حوالوں کی ضرورت نہ ہوگی۔

☆

کتابیات

نمبر شمار	نام کتاب	مصنف/مولف	جائے طباعت	سن طباعت
۱	اقبال نامہ	شیخ عطاء اللہ	لاہور	۲۰۰۵ء
۲	اقبال بنام شاد	محمد عبداللہ قریشی	لاہور	۱۹۸۶ء
۳	اقبال اور حیدر آباد دکن	نظر حیدر آبادی	لاہور	۱۹۸۱ء
۴	اقبال کا آخری معرکہ	سیّد نور محمد قادری	لاہور	۱۹۸۷ء
۵	انوار اقبال	بشیر احمد ڈار	کراچی	۱۹۶۷ء
۶	اقبال اور انجمن حمایت اسلام	محمد حنیف شاہد	لاہور	۱۹۷۶ء
۷	انوار شاہ جماعت (قلمی)	مرزا ذوالفقار علی بیگ فیاض حیدر آبادی	-	-
۸	اوراق گم گشتہ	پروفیسر رحیم بخش شاہین	لاہور	۱۹۷۹ء
۹	انسائیکلو پیڈیا تحریک پاکستان	اسد سلیم شیخ	لاہور	۱۹۹۹ء
۱۰	اوراق پارینہ (کشمیریات)	خواجہ غلام احمد پنڈت	مظفر آباد (آزاد کشمیر)	سن ندارد
۱۱	احوال و آثار پروفیسر محمد طاہر فاروقی	محمد شفیق شاہد	پشاور	۲۰۰۱ء
۱۲	اکابر تحریک پاکستان جلد دوم	محمد صادق قصوری	لاہور	۱۹۷۹ء

۱۳	بال جبریل	اقبال	لاہور	۱۹۴۷ء
۱۴	بیعت اقبال	صاحبزادہ شبیر کمال عباسی	گوجرانوالہ	۱۹۹۴ء
۱۵	پنج گنج علی پوری	مولانا محمد اویس خاں غوری	لیہ	طبع دوم
۱۶	تحریک پاکستان میں علماء و مشائخ کا کردار	محمد صادق قصوری	لاہور	۲۰۰۸ء
۱۷	پنجابی شاعراں دا تذکرہ	مولا بخش کشتہ	لاہور	۱۹۶۰ء
۱۸	تذکرہ شعرائے جماعتیہ	محمد صادق قصوری	برج کلاں قصور	۲۰۰۶ء
۱۹	تذکرہ شاہ جماعت	سیّد حیدر حسین علی پوری	لاہور	۱۹۷۳ء
۲۰	مجالس اقبال	پروفیسر جعفر بلوچ	لاہور	۲۰۰۲ء
۲۱	وفیاتِ مشاہیر پاکستان	پروفیسر محمد اسلم	اسلام آباد	۱۹۹۰ء
۲۲	وفیاتِ ناموران پاکستان	ڈاکٹر محمد منیر احمد سلیچ	لاہور	۲۰۰۶ء
۲۳	تذکرہ شاہ جماعت	عبدالقادر فیاض بلگوڈوی	میسور	۱۹۵۴ء
۲۴	تحریک پاکستان میں سیال کوٹ کا کردار	خواجہ محمد طفیل	سیال کوٹ	۱۹۸۷ء
۲۵	جہان اقبال	ڈاکٹر سیّد معین الرحمٰن	لاہور	۱۹۹۷ء
۲۶	حضرت مجدد الف ثانی اور ڈاکٹر محمد اقبال	ڈاکٹر محمد مسعود احمد	سیال کوٹ	۱۹۸۰ء
۲۷	حیات اقبال کی گمشدہ کڑیاں	محمد عبداللہ قریشی	لاہور	۱۹۸۲ء
۲۸	حیات مقدسہ	سلیم تمنائی میسوری	میسور	۱۹۷۴ء

۲۹	جامع اردو انسائیکلو پیڈیا جلد اول	شیخ غلام علی اینڈ سنز	لاہور	۱۹۸۷ء
۳۰	حضرت امیر ملت اور اُن کے خلفاء	محمد صادق قصوری	سیال کوٹ	۱۹۸۳ء
۳۱	حضرت امیر ملت اور تحریک پاکستان	محمد صادق قصوری	لاہور	۱۹۹۴ء
۳۲	حیات فخر	نواب مشتاق احمد خاں	لاہور	۱۹۶۶ء
۳۳	خدوخال اقبال	محمد امین زبیری	کراچی	۱۹۸۶ء
۳۴	خفتگان خاک لاہور	پروفیسر محمد اسلم	لاہور	۱۹۹۳ء
۳۵	دانائے راز	سیّد نذیر نیازی	لاہور	۱۹۷۹ء
۳۶	دکن کا آخری تاجدار	محمد احمد خاں	کراچی	۱۹۷۷ء
۳۷	روحانیت اقبال	صاحبزادہ شبیر کمال عباسی	گوجرانوالہ	۱۹۹۴ء
۳۸	رجال اقبال	عبدالروف عروج	کراچی	۱۹۸۸ء
۳۹	سبیل الرشاد	سیّد ممتاز علی	لاہور	۱۹۳۵ء
۴۰	سیرت اقبال	پروفیسر ڈاکٹر محمد طاہر فاروقی	لاہور	۱۹۶۶ء
۴۱	سیرت امیر ملت	سیّد اختر حسین علی پوری	علی پور سیداں	۱۹۷۵ء
۴۲	سیرت امیر ملت جلد اول	سیّد اختر حسین علی پوری	لاہور	۲۰۰۸ء
۴۳	کلید کلیات اقبال (اُردو)	احمد رضا	لاہور	۲۰۰۵ء
۴۴	ذکر اقبال	عبدالمجید سالک	لاہور	۱۹۵۵ء
۴۵	معاصرین اقبال کی نظر میں	محمد عبداللہ قریشی	لاہور	۱۹۷۷ء
۴۶	ضرب کلیم	اقبال	لاہور	۱۹۷۰ء

نمبر	کتاب	مصنف	مقام	سن
۴۷	صوفیہ نقشبند	حکیم سیّد امین الدین احمد	لاہور	۱۹۷۳ء
۴۸	کرامات امیر ملت	بخشی مصطفیٰ علی خاں میسوری	کراچی	۱۹۶۵ء
۴۹	غازی علم الدین شہید	رائے محمد کمال	لاہور	۱۹۸۳ء
۵۰	زندہ رُود	ڈاکٹر جاوید اقبال	لاہور	۲۰۰۴ء
۵۱	علامہ اقبال سے آخری ملاقاتیں	صوفی غلام مصطفیٰ تبسم	لاہور	۱۹۸۹ء
۵۲	شیدایان امیر ملت	محمد صادق قصوری	برج کلاں قصور	۱۹۹۸ء
۵۳	مثنوی اسرار خودی	اقبال	لاہور	۱۹۶۴ء
۵۴	مثنوی پس چہ باید کرد مع مسافر	اقبال	لاہور	۱۹۷۲ء
۵۵	مئے لالہ فام	ڈاکٹر جاوید اقبال	لاہور	۱۹۹۶ء
۵۶	مہر منیر	مولانا فیض احمد فیض	گولڑہ شریف	۱۹۷۶ء
۵۷	فدایان امیر ملت	محمد صادق قصوری	برج کلاں قصور	۱۹۸۱ء
۵۸	کاروان تحریک پاکستان	محمد صادق قصوری	لاہور	۲۰۰۵ء
۵۹	قائد کشمیر	بشیر احمد قریشی	مظفر آباد(A.K)	۱۹۹۴ء
۶۰	شہاب نامہ	قدرت اللہ شہاب	لاہور	۱۹۹۲ء
۶۱	کشمیر آزادی کی دہلیز پر (یادوں کے چراغ)	خواجہ غلام احمد پنڈت	لاہور	۱۹۹۱ء
۶۲	سبزۂ بیگانہ	شیخ عبدالشکور	کراچی	۱۹۸۰ء
۶۳	ملفوظاتِ امیر ملت	حاجی محمد عثمان حیدرآبادی	حیدرآباد دکن	۱۹۵۰ء
۶۴	ملفوظاتِ امیر ملت	حاجی محمد عثمان حیدرآبادی	قصور	۱۹۶۵ء
۶۵	ملفوظاتِ امیر ملت	حاجی محمد عثمان حیدرآبادی	لاہور	۱۹۷۶ء

۶۶	مکتوبات اقبالؔ بنام گرامی	محمد عبداللہ قریشی	لاہور	۱۹۶۹ء
۶۷	کلیات طغرائی	صوفی غلام مصطفیٰ تبسم	لاہور	۱۹۳۳ء
۶۸	سیر افغانستان	سیّد سلیمان ندوی	کراچی	۱۹۸۷ء
۶۹	اقبال اور تحریک آزادیٔ کشمیر	غلام نبی خیال	لاہور	۱۹۹۹ء
۷۰	متعدد ماہنامے ،ہفت روزے اور روزنامے وغیرہ			

ناشر: انٹرنیشنل انجمن خُدّام الصُّوفیہ وامیرِ ملّت ٹرسٹ پاکستان و برطانیہ